ہمگام

1۔ماضی کے تجربہ	نودبندگ بلوچ	2
2۔اتحاد کا نعرہ مستانہ	زامر بلوچ	9
3۔جمہور،انحراف جنگ	اسلم بلوچ	12
4۔صورت خان مری	انٹرویو	17
5۔شکستہ دیوار	شاہ جی بلوچ	24
6۔آزادی کا روڑمیپ	عرفان خلیل	29
7۔بلوچ تحریک کا عروج وزوال	شبیر بلوچ	33
8۔صرف ایک سوال	باغی میر	38
9۔بی ایل ایف پالیسی بیان	گوہرام لہڑی	41
10۔جان فرمن	انٹرویو	45
11۔پاکستان کی جنگی جرائم	حمل بلوچ	49

web. www,humgaam.com

Email. Humgaam@ymail.com

”ہم ماضی کے تجربوں سے نہیں سیکھتے
بلکہ ان تجربوں پر غور کرنے سے سیکھتے ہیں“

تحریر۔نودبندگ بلوچ

بلوچ قومی تحریک آزادی مختلف مدوجزر سے گذر کر آج ایک ایسے مقام پر آپہنچا ہے کہ جہاں سے ہمارے ہر فیصلے کا گہرا اور فیصلہ کن اثر مجموعی طور پر بلوچ مستقبل پر پڑے گا۔گذشتہ 15 سال کے دوران بلوچ تحریک اپنی تئیں مختلف خامیاں،کمزوریاں اور کوتاہیاں رکھنے کے باوجود ہمیں کامیابیاں سمیٹتی نظر آئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دوران تحریک اپنی اندراتنی سکت رکھتا تھا کہ وقت کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرسکے، وقت کی ضرورت تحریک کی ترویج اور بلوچ عوام کو زیادہ سے زیادہ تحریک کی جانب مائل اور حق میں قائل کرنا تھا۔شہداء کی قربانیوں اور کئی جہد کاروں کے شبینہ روز محنت نے یہ ممکن بنایا، بلوچ نوجوان جوق در جوق تحریک سے جڑنے لگے ایک ایسا بھی وقت آیا کہ کوئٹہ کے شاہراہوں پر ہزاروں کی تعداد میں بلوچ حمایت سرمچاران ریلی نکالا کرتے تھے ،کہیں بھی کوئی جلسہ ہوتا یا آشوبی دیوان لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے، یہ سب تحریک کا ابتدائی دور تھا تب تک ریاست مکمل ایک فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ تحریک سے کیسے نمٹا جائے کبھی پیکج کی لالچ تو کبھی پولیس تھانوں میں بند کرنا اور کبھی اغواء کرکے کچھ ہفتے یا مہینے تشدد کرکے چھوڑ دینا،لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ریاست اپنی پالیسیوں پر غور کرنے کے بعد ایک حتمی طریقہ کار اور فیصلے تک آپہنچا اور بلوچ تحریک کی بیخ کنی کرنے کیلئے قتل عام کے آپشن کا اپنے لیئے چناو کیا۔جب ریاست اپنی چال اور ڈگر دونوں بدلنے کے بعد ہم پر وارد ہوا تو ہم کچھ خاص سمجھ نہیں سکے اور اپنے اسی رستے پر گامزن رہے جس پر چل کر ہمیں ماضی میں کچھ فائدے حاصل ہوئے تھے۔جس کی وجہ سے ہمیں بہت سے ایسے قیمتی دوستوں کی نقصان کا بھگتنا پڑا جن کی خلیج پر کرنے میں شاید ہمیں برسوں لگے۔ایک طرف سے ہماری جنگی حکمت عملیاں نئے اور غیر روایتی پن کیلئے محوا انتظار ہیں تو دوسری طرف ہماری سیاسی سوچ کے چہرے پر اب جھریاں پڑ چکی ہیں جس میں اب اتنی توانائی اور سکت نہیں کے طاقت ور دشمن کا مقابلہ کرسکے، یہاں ایک سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آخر کیونکر یہی بوڑھی سیاست اور روایتی محاذ جنگ 15 سال ہماری ضروریات پورا کرتا رہا لیکن اب نہیں کرپارہا؟ کیونکہ جب وقت کی ضرورت قوم کو اپنی طرف مائل اور قائل کرنے کا تھا تو جذبہ قربانی اور مقصد کے ساتھ مخلصی نے یہ ضرورت پورا کردیا، اب قوم یا تو آپ کے ساتھ ہے اور اگر کہیں خاموش اکثریت کی صورت میں آپ کے ساتھ نہیں تو کم ازکم بہت دلچسپی سے آپ کو دیکھ رہا ہے ،پرکھ رہا ہے اور آپ کے اگلے قدم اس امر کا بھی فیصلہ کردیں گے کہ یہ خاموش اکثریت کس طرف کروٹ لے گی۔قطع نظر اس کے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جذبہ قربانی اور مقصد سے مخلصی لوگوں کو قائل تو کرسکتے ہیں لیکن یہ کامیابی کی ضمانت نہیں، لوگوں کی آپ کی طرف متوجہ ہونے کے بعد اب آپ کی اصل آزمائش ہے کہ آپ انہیں منظم اور متحرک کیسے کرسکتے ہیں، ان کی قوت کو آپ کیسے یکجا کرکے عظیم قوت بنا کر دشمن کو اس سے شکست دے سکتے ہیں، آپ کیسے دشمن کے مقابلے میں اسے بہتر مستقبل کا خاکہ دے سکتے ہیں، عالمی اور خطی چیلنجز کا آپ کیسے مقابلہ کریں گے اور سب سے بڑھ کر آپ کیسا سے ناکام ہونے نہیں دینگے، مایوس نہیں کریں گے،عوامی قوت کا ذمہ داری سے استعمال کریں گے اور عوام سے حاصل ہونے والی قوت کو اسکے ہی خلاف استعمال نہیں کریں گے۔لیکن ذرا رکیئے! کیا واقعی ہم میں اتنی سکت ہے؟ کیا واقعی ہمیں پتہ ہے کہ ہم کیا کرنے جارہے ہیں؟ یا ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ کیا واقعی ہماری سوچ، تنظیمیں، ڈھانچے،طریقہ کار، حکمت عملیاں، نفسیات، رجحانات اس خطوط پر استوار ہیں کہ ہماری موجودہ حالات کے تقاضوں اور ضروریات کو پوری کرسکیں؟ میرے خیال میں نہیں، کیونکہ موجودہ صورتحال کو دیکھا اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے اندر کچھ مہلک کمیاں موجود ہیں۔ان کمیوں کو سمجھنے کیلئے میرے خیال میں ضروری ہے کہ ہم مندرجہ ذیل سوالات پر غور کریں اور بغیر کسی لگی لپٹی غیر جانبداری سے انکا جواب تلاش کریں۔

1۔جب سرکاری ڈنڈا چلنے لگا تو ہماری سیاسی پارٹیاں اور تنظیمیں کیوں جامد ہوکر رہ گئیں؟ اگر تھوڑا بہت کام ہونے بھی لگا تو صرف ان علاقوں میں جہاں مسلح تنظیمیں اثر و رسوخ رکھتی ہیں، سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا مسلح محاذ سیاسی محاذ کو گراونڈ دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے یا یہ سیاسی محاذ کی ذمہ داری ہے کہ مسلح محاذ کیلئے گراونڈ تیار کرے؟ میرے خیال میں اس جامدپن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری ساری سیاسی پارٹیاں اور تنظیمیں آج بھی

وہی ڈھانچہ اور طریقہ کار رکھتے ہیں جو 2001 سے پہلے تھیں حتیٰ کے بی این پی مینگل، نیشنل پارٹی اور ہمارے انقلابی پارٹیوں کے طریقہ کار اور ڈھانچے میں آزادی کے نعرے کے سوا کوئی فرق نہیں۔ہم آج تک سیاست کا مطلب جلسوں نعروں، چاکنگ، اخباری بیانات اور زیادہ سے زیادہ ممبر شپ کے حصول کو سمجھتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ زمینی حالات مکمل بدل گئے اور آپ نکا بھر بدلے بغیر پرانے نتائج چاہتے ہیں۔یہ ایسا ہے کہ آپ 25 سالہ نوجوان کو اس کے 10 سال کے عمر کے جوتے پہنائیں اور امید بھی رکھیں کہ وہ اس کے ناپ پر آجائیں گے۔اس پرانے طریقہ کار پر چمٹے رہنے کی سب سے بڑی وجہ ہماری موضوعیت پسندی ہے یعنی ماؤ نے چین میں جو ماڈل اپنا کر کامیابی حاصل کی یا کاسترو کا کیوبا ماڈل کامیاب ماڈل ہے ہمیں بھی اسی پر چل کر کامیابی ملے گی، ذرا سوچیں کیوبا کا سب سے بڑا قومی وسائل "گنا" تک بلوچستان کی زمین میں نہیں اگ سکتا یہ نسخہ آزادی من و عن کیسے کارآمد ثابت ہوگی؟۔

2۔میرا دوسرا سوال بہت سادہ ہے،کیا براہمداغ بگٹی کی زندگی میں کوئی اور بی آر پی کا صدر بن سکتا ہے؟اور اسی طرح کیا اختر مینگل کی زندگی میں کوئی اور بی این پی کا صدر بن سکتا ہے؟میرے دانست کے مطابق اگر ہم ذرا حقیقت پسندی سے غور کریں تو دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ملے گا،اب سوچیں کے نعرہ آزادی کے فرق کو نکال لیں تو پھر آپ کو یہاں انقلابی اور ردِ انقلابی میں کیا فرق نظر آتا ہے؟فرق چھوڑیں یہاں تو پھر ردِ انقلابی ہمیں زیادہ بہتر لگنے لگتا ہے۔یہاں میرا مقصد اختر مینگل کو اچھا اور براہمدغ بگٹی کو برا ثابت کرنا نہیں ہے۔میں صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہم نے اپنے رویے بالکل نہیں بدلے ہیں،حالات بدل گئے،زمینی حقائق بدل گئے ،وقت کے تقاضے بدل گئے،خطے کی سیاست بدل گئی،دشمن کے چال بدل گئے،حتیٰ کے دنیا بدل گئی لیکن اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ ہمارے رویے ہیں،شروع دن سے ہمارے پارٹی بنانے اور قومی (قبائلی) اتحاد بنانے کے طریقے ایک ہی رہے ہیں،چار لوگوں کو جمع کرو ،کچھ پیسے اور اسلحہ کا بندوبست کرو پریس کلب میں جا کر اعلان کرو تو تیار ہو گیا،پھر وجود برقرار رکھنے کیلئے گاہے بگاہے تھوڑی بہت ہلچل مچاتے رہو۔کیا یہ رویئے ہمیں وہ سماج اور آزادی دے سکتے ہیں جس میں ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ انہی رویوں کو تل دھرنے کا بھی جگہ میسر نا ہوگا؟۔کیا یہ غیر جمہوری رویئے جمہوریت کو پیدا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ رد انقلابی رویئے انقلاب کو برپا کر سکتے ہیں؟ذرا وقت کا مذاق ملاحظہ ہو ہم غیر جمہوری، غیر انقلابی اور رجعتی رویوں،سوچ اور طریقہ کار سے ایک جمہوری ترقی پسند انقلاب برپا کرنے نکلے ہیں۔پیپل کے پیڑ کی سالوں آبیاری کرو کبھی اس پر آم نہیں اگیں گے۔

3۔کیا بلوچ عوام ہمارے بندوق کی گرج سے ہمارا ہمراہ بن سکتا ہے؟پاولو فریرے کیا خوب کہتا ہے کہ غلام کی سب سے بڑی خواہش آقا بننا ہوتا ہے آزادی نہیں اور بقول فریرے آقا اور غلام اصل میں دونوں ہی غلام ہوتے ہیں۔ہم بھی شاید کچھ خاص مختلف نہیں لڑنا ہم نے اس لیے شروع کیا کیونکہ ہمیں طاقت سے دبایا جا رہا تھا لیکن اب تھوڑی بہت طاقت پا کر ہم خود منصف،وکیل،مدعی اور جلاد بن کر اسی طاقت سے لوگوں کو دبانا چاہتے ہیں،ذرا غور کریں گذشتہ 5 سال کے دوران صرف مکران سے آپ نے کتنے پریس کانفرنس دیکھیں ہیں اور کتنی اپیلیں سنی ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ ہمارے فلانے عزیز،قریب یا رشتہ دار کو مسلح تنظیم نے بیگناہ مار دیا؟اگر ان اپیلوں میں سے دس فیصدی بھی جائز ہوں تو پھر ذرا تو سوچیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟پھر ذرا غور کریں کہ غلامی سے نجات کے اس جنگ میں ہمیں جو محدود طاقت عوام کے بل بوتے پر حاصل ہوئی ہے اسکا ہم کیسا استعمال کر رہے ہیں،کہیں ہم وہ غلام تو نہیں بن رہا جو طاقت پانے کے بعد آزادی کے بجائے آقا بننے کا چناو کرتا ہے؟ذرا طاقت کا استعمال ملاحظہ ہو،ان منشیات فروشوں کو پہلے سر عام بے عزت کر کے مارو جو منشیات فروشی سے بمشکل دو وقت کی روٹی نکالتے ہیں،پھر انہیں قتل کر دو(یہاں بڑے منشیات فروشوں کی استثنیٰ بھی سمجھ سے بالا ہے)،پیٹ کاٹنے والا غریب بلوچ،اسے کاٹ کر جس گاڑی میں شہر لیجاتے ہیں وہ بھی کسی غریب بلوچ کا ٹھیکیدار اور مزدور بھی غریب بلوچ اور اوپر سے یہ واحد وسیلہ ہے جس کے بیچنے سے شاید سرکار کو نکا بھر فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اپنے طاقت کا دھونس ان کے خلاف استعمال کرو ،کبھی انکی گاڑیاں جلا دو تو کبھی انہیں مار دو،دشمن کے سامنے چار گز زمین دفاع کرنے کی سکت نہیں لیکن نوجوانوں کو پکنک منانے پر مرغا بنا کر مارو،یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ بلوچ عوام جسے دشمن پاکستان 66 سال سے طاقت کے دم پر دبانے اور اپنی مرضی پر چلانے میں ناکام ہوا،کیا آپ اسے اپنے محدود طاقت سے دبانے میں کامیاب ہونگے؟ یہاں طریقہ کار

شخصیت پرست معاشرے میں جب دیوہیکل شخصیتوں کو پکارا گیا اوران کے ہر عمل کے بارے میں گن گن کر سوال ہونے لگے تو اچھے خاصے ترقی پسند اور انقلابیوں کی قوت برداشت،چہرے پر جعلی مسکراہٹ،اخلاقی حدبندیاں بھی انکا ساتھ چھوڑنے لگیں،پہلے پہل اس عمل کو روایتی طریقہ کار سے دھونس دھمکیوں اور ہتک آمیز لب و لہجہ کے ذریعے چپ کرانے کی کوشش کی گئی اور جب یہ ناکام ہوا تو اپنے اپنے مخصوص دستیاب طاقت سے برچھے پھینکے گئے،

اور رویے بدل جانے کے متقاضی ہیں۔

4۔ کیا ہم سائنسی اور انقلابی خطوط پر اداروں کی تشکیل کر پائے؟ یا اجزاء کے بیچ حد بندیاں کھینچ کر توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ تحریک پورے سماج کے ہر طبقے کو اپنے اثر میں لیکر تمام شعبہ ہائے جات میں انقلاب برپا کرتا ہے، اسی لیئے ضروری ہے کہ ہر شعبے میں انقلابی خطوط پر کام ہو اور بعد ازاں سب ایک نقطے پر مرتکز ہو جائیں، لیکن یہاں پتہ نہیں چلتا ہے کہ کس کا کیا کام ہے، بی ایس او کولیں جو بیک وقت، طلبہ تنظیم، ماس پارٹی اور کبھی کبھار مسلح تنظیموں کے بھرتی سینٹر کے طور پر کام کرتی ہے، اس کردار میں بھی اپنی آزاد حیثیت سنبھالنے میں دقت کا سامنا کرتے ہوئے کبھی ایک پارٹی سے دوسرے پارٹی اور کبھی ایک مسلح تنظیم سے دوسرے مسلح تنظیم کے بیچ ہچکولیاں کھاتی ہے، یہاں طے نہیں ہو پایا کہ کس کا کیا کام ہے اور ایک ادارے کا دوسرے ادارے کے ساتھ تعلقات کا معیار اور حد کیا ہوگی۔ تحریک ایک ایسے موڑ پر آ گئی جہاں ہم کسی فیصلہ کن موڑ کی طرف جا سکتے ہیں لیکن اندر سے خستگی کا عالم یہ کہ پاکستانی نفسیات سے اٹی ہوئی ہماری سوچ ہمیں کسی فیصلہ کن تبدیلی کی جانب جانے سے روک رہی ہے، سائنسی حد بندیاں کہاں یہاں اخلاقی حد بندیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں دیکھیں کہ بی ایل ایف کی قیادت بی این ایم کے قیادت کو اپنے بندوق بردار وں کی طاقت کی دھمکی دیکر اسے اپنا زیر نگیں کرتا ہے اور پھر پارلیمانی جماعتوں کے حربے اور ٹوٹکے استعمال کرتے ہوئے بی ایس او کو بھی اپنا بار بردار بنا دیتا ہے۔ جن فیصلوں کو ان سیاسی جماعتوں کے اپنے اداروں میں ہونا چاہیے تھا اب وہ کسی مسلح تنظیم کے سینٹرل کمانڈ کے میٹنگوں میں ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب بندوق سیاست کے تابع ہو تو عظیم قومیں بناتی ہے اور جب سیاست بندوق کے تابع ہو جائے تو پاکستان بن جاتا ہے، جس طرح پاکستان میں فوج نے سیاست کو اپنے دھونس کے تابع کیا ہوا ہے اور اس کے کیا نتائج نکلے ہیں اس سے سب بخوبی واقف ہیں یہاں پریشان کن بات یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان سے چھٹکارے کیلئے ہم نکلے ہیں تو دوسری طرف بی ایل ایف انہی پاکستانی رویوں کو مستعار لیئے بلوچ سیاست کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی ہے۔ 2011 تک کسی نا کسی حد تک کچھ اخلاقی حد بندیاں تھی جس کی وجہ سے آپ تب تک کے سیاسی پارٹیوں کے کردار کو قابلِ تعریف نہیں تو تسلی بخش ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن اب ذرا غور کریں کہ 2011 کے بعد جب بی ایل ایف نے وہ اخلاقی حد بندیاں توڑتے ہوئے سیاسی جماعتوں میں پاکستانی آرمی کے طرز پر مداخلت شروع کی تو پھر بلوچ سیاسی پارٹیوں کی کیا حشر ہوگئی۔ ان حد بندیوں کے نا ہونے اور جو اخلاقی حد بندیاں تھیں ان کے ٹوٹنے کے بعد سے اب تک بلوچ سیاست میں جو تضادات و اختلافات سامنے آئے ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہیں۔ اب جب تک کہ ان حد بندیوں کو واضح کر کے ان پر کاربند نہیں ہوا جائے گا تب تک ہم تحریک کو کوئی منظم شکل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور حالت ذرا اسی طرح رہی تو ٹکراو کی کیفیت بھی بعید از قیاس نہیں۔ گاڑی کے چار ٹائر ہوتے ہیں ہر ٹائر ایک خاص حد میں رہ کر زور لگاتا ہے بعد ازاں سب کا زور مل کر ایک دیوہیکل گاڑی کو بھی کھینچ کر آگے بڑھاتی ہے لیکن اگر ان ٹائروں کی تال میل ٹوٹ جائے تو گاڑی آگے نہیں بڑھتی بلکہ کھائی میں گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر اللہ نظر جیسا انقلابی بھی اپنے ذات پر بات کو آتے دیکھ کر اپنی قوت برداشت کھو بیٹھے اور بی ایل ایف کے بیساکھیوں کو استعمال کرتے ہوئے نواب خیر بخش مری کے کندھے پر بندوق رکھ کر چار پالیسی بیانوں کے ساتھ لبوں پر مہر لگانے نکلے۔

5۔ کیا قبضہ گیر کے نفسیات سے آزادی حاصل کیئے بغیر جغرافیائی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے؟

گروہیت، انفرادیت پسندی، شخصیت پرستی، موقع پرستی، ہیروازم، نرگسیت، دھوکہ دہی، مبالغہ آرائی وغیرہ یہ کچھ ایسے نفسیاتی بیماریاں ہیں، جو ہمارے طرز انقلاب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں، حیرت یہ ہے کہ اتفاق سے انقلاب ان ہی رویوں کو ملیا میٹ کرنے کا نام ہے، لیکن ہم ان کی انگلی تھامے آگے بڑھ رہے ہیں، یہ ساری نفسیاتی بیماریاں ہم نے اپنے قابض سے مستعار لی ہوئی ہیں، ان کے خلاف بولتے بولتے ہم نہیں تھکتے لیکن جب بھی موقع ملا ان سے ایسے بے ڈھنگے طریقے سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں کہ ظرا انقلاب جھک جاتی ہے۔ ذرا غور کریں کہ صد احترام بابا خیر بخش مری چالیس سالوں تک اپنا دامن غلیظ سیاست کے کیچڑ سے بچانے کے بعد بھی آکر 90 سال کی عمر میں ایک انقلابی تنظیم بی ایل اے کو اپنی قبائلی حیثیت قائم رکھنے کیلئے دولخت کر دیتے ہیں، ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ کئی سالوں تک جن دوستوں کے ساتھ جان کی بازی لگا کر ساتھ رہے درونِ خانہ انہی کو تنہا کرنے اور اپنی انفرادی حیثیت کو سب سے بالا کرنے کی تگ و دو میں رہے، بی ایل اے 12 سالوں تک بی ایل ایف کو اپنا حصہ سمجھتے ہوئے ہر ممکن مدد کرتا چل رہا تھا لیکن ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ ایک طرف عہدو پیماں کرتا اور دوسری طرف بی ایل ایف کو باقی تحریک سے کاٹ کر ایک جدا حیثیت دینے میں مشغول تھا، معلوم نہیں جب جزوں کو کل بننا تھا اس وقت کل کو جزوں میں بانٹ کر ڈاکٹر صاحب تحریک کی کونسی خدمت کر رہے تھے، مہران مری لاکھوں کے کرپشن کے بعد احتساب کیلئے پیش ہونے کے بجائے ایک

نئی تنظیم کا سربراہ بن جاتے ہیں، میر عبدالنبی پوری زندگی جیل و زندانوں میں گذارنے کے باوجود آخر میں یہ کہہ کر ایک غیر انقلابی اور گروہی قدم کی تائید کرتے ہیں کہ وہ اپنے پرانے رفیق کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے، قادر مری خاندان کے 20 سے زائد افراد تحریک پر قربان کرنے کے بعد بھی قومی مڈی پر قبضہ جما کر حالات خانہ جنگی تک پہنچا دیتے ہیں اور وجہ صرف یہ کہ میں اپنے قبیلے کے نواب سے نہیں مکر سکتا، براہمداغ بی ایل اے اور ساتھ ساتھ بی این ایم کے سربراہ بننے کی دعوت کو ٹھکرا کر اپنے لیئے ایک نئے مسلح اور سیاسی گروہ کو تشکیل دینے کو ترجیح دیتے ہیں وجہ صرف یہ کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ ہونے کے بجائے اپنی مطلق العنانی کے طلبگار ہوتے ہیں، قصہ مختصر یوں کہ ہم انقلاب کے گود میں کھیلنے آگئے لیکن ہماری سوچ ابھی تک پالیمانی طرز سیاست میں اٹکی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تک ہماری ترجیحات جس پرانے بوسیدہ عمارت سے جڑی ہونگی ہم اسے منہدم کیسے کریں گے؟

یہ تو چند ایک ایسے بیڑیاں ہیں جو ہمارے پیروں سے جکڑے ہوئے ہیں اور جو ہمیں آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں، لیکن اب وہ وقت آگیا ہے جب ان بیڑیوں سے ہمیں چھٹکارہ حاصل کرنا ہوگا۔ ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا طریقہ کار بھی وضع ہے اور اگر ہم چاہیں تو اتنا مشکل بھی نہیں، ایسے حالت میں اگر پورے صورتحال کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کرکے سب سے پہلے ان تمام کوتاہیوں کی نشاندہی کی جائے اور ہر اس عمل پر تنقید کی جائے جو روا انقلاب کے زمرے میں آتا ہو، ہر اس عمل پر سوال اٹھایا جائے جو اپنی تئیں مشکوک پہلو رکھتا ہو، ہر مسئلہ پر کھلے ذہن بحث مباحثہ کی جائے دلائل پیش کیئے جائیں اور حل و نعم البدل پیش کیئے جائیں تو میرے خیال میں ہم ایک ایسا بنیاد ضرور رکھ سکتے ہیں جس پر کھڑی عمارت مضبوط اور دیرپا ثابت ہوگی۔ اسی امر کو ملحوظ خاطر رکھ کر کچھ سیاسی دوستوں نے ایک غیر روایتی طریقہ کار اپنا کر اور پرانی ریتوں کو توڑتے ہوئے حتی الامکان دستیاب ذریعے سوشل میڈیا پر سوال، بحث اور تنقید کے سلسلے کا آغاز کیا، اس عمل سے چیزیں ایسی صاف اور شفاف انداز میں ہر سیاسی سوچ کے مالک بلوچ کو دکھنے لگیں جیسے نکاسی آب کی سہولت پا کر کسی تالاب کی گہرائی دکھتی ہے۔ اب کیونکہ یہ ایک ایسا عمل تھا جو اس سے پہلے بلوچ تاریخ میں وقوع پذیر ہوا اور نا ہی کسی نے اس کی وکالت کی تھی تبھی اس کی وجہ سے بلوچ سیاست میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی شخصیت پرست

ہماری پہلے نسلیں سوال و تنقید سے اس لیئے بھاگتے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ وہ اکیلا رہ جائیں گے، لوگ ان پر ہنسیں گے انہیں پاگل، ایجنٹ اور رد انقلابی کہیں گے، انہیں برا بھلا کہا جائے گا، قد آور لیڈروں کے سامنے ان کی بات جا کر چھوٹی منہ بڑی بات بن جائے گی۔

معاشرے میں جب دیوہیکل شخصیتوں کو پکارا گیا اور ان کے ہر عمل کے بارے میں گن گن کر سوال ہونے لگے تو اچھے خاصے ترقی پسند اور انقلابیوں کی قوت برداشت، چہرے پر جعلی مسکراہٹ، اخلاقی حدبندیاں بھی انکا ساتھ چھوڑنے لگیں، پہلے پہل اس عمل کو روایتی طریقہ کار سے دھونس دھمکیوں اور ہتک آمیز لب و لہجہ کے ذریعے چپ کرانے کی کوشش کی گئی اور جب یہ نا کام ہوا تو اپنے اپنے مخصوص دستیاب طاقت سے برچھے پھینکے گئے، ڈاکٹر اللہ نظر جیسا انقلابی بھی اپنے ذات پر بات کو آتے دیکھ کر اپنا قوت برداشت کھو بیٹھے اور بی ایل ایف کے بیساکھیوں کو استعمال کرتے ہوئے نواب خیر بخش مری کے کندھے پر بندوق رکھ کر چارپا لیسی بیانوں کے ساتھ لبوں پر مہر لگانے نکلے۔

یہاں اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ آخر کیوں یوں تمام انقلابی تنظیموں اور لیڈروں پر انگلی اٹھائی جاتی ہے ان کے ہر عمل پر سوال اٹھایا جاتا ہے ان کے کردار پر تنقید کی جاتی ہے۔ آیا اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اور اگر ہم ایسا نا بھی کریں تو پھر اسکا کیا نقصان ہوسکتا ہے؟، میرے خیال میں بولنے سے ہمیں جو بھی فائدہ یا نقصان ہوگا اس کا فیصلہ وقت کرے گا لیکن خاموش رہنے سے ہمیں کیا کیا نقصانات ہوئے اس کا فیصلہ تاریخ کرچکا ہے، آیئے ذرا اپنی تاریخ میں جھانکتے ہوئے اپنی ان بدبختیوں پر نظر ڈالتے ہیں جن کو ہمارے خاموشی نے جنم دیا۔

ہماری خاموشیوں کی تاریخ کافی طویل ہے جب پاکستان نے 27 مارچ 1948 کو بلوچستان پر قبضہ کیا تو قبضے کے فوراً بعد اس نے واحد بلوچ پارٹی قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی پر پابندی عائد کردی۔ اس پابندی کے بعد اس وقت کے سیاسی "گرو" اور بلوچ سیاست کے سرکردہ رہنما غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر، عبدالعزیز کرد ، ملک فیض محمد خان یوسفزئی وغیرہ سب نے میدان خالی چھوڑ دیا، اس دوران کوئی بھی سیاسی تحریک نہیں چلائی گئی جس سے قابض پاکستان کو یہ موقع مل گیا کہ وہ قبائلی سرداروں کو جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل کرکے بلوچستان کا سیاسی رول سرداروں کے حوالے کردے، جس کے اثرات آج تک ہماری سیاست میں موجود ہیں۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے کالعدم ہونے کے بعد 1954 تک کوئی نئی سیاسی پارٹی تک بنانے کی کوشش نہیں کی گئی بعد ازاں جب 1954 میں آغا عبدالکریم خان جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے سارے سیاسی کارکنوں کو کراچی میں جمع کرکے ایک نئی سیاسی پارٹی

اور پاکستانی قبضہ کے بعد پہلی سیاسی پارٹی ”استمان گل“ بنانے میں کامیاب ہوئے ۔اگر اس وقت یہ پوچھا جاتا کہ 1948 سے لیکر 1954 کے بیچ کے سب سے اہم دور میں کیوں کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی گئی؟ یا کیوں کوئی سیاسی تحریک نہیں چلائی گئی؟ تو شاید آج صورتحال مختلف ہوتی، لیکن اس وقت بھی ہم نے ان دیوہیکل شخصیتوں کے

غوث بخش بزنجو شریک ہوتے ہیں، جس میں انہی تینوں مذکورہ اشخاص کو ذمہ داری دی جاتی ہے کہ وہ کسی بھی طور جوڑتوڑ کر بی ایس او کو نیپ کا پاکٹ آرگنائزیشن بنائیں ۔پھر یہی تینوں اشخاص تاریخ میں پہلی بار اپنے گروہی مفادات کیلئے نوجوانوں کو تقسیم کرتے ہیں اور 1967 میں جوڑتوڑ کراپنی زیرنگرانی بی ایس او کا کونسل سیشن منعقد کر کے ڈاکٹر

غوث بخش بزنجو بلوچ سیاست میں موقع پرستی، چاپلوسی، باجگواری، بکاوپن کا زہر گھولتے رہے اور ہم کہتے رہے کہ ”میر غوث بخش بابائے سیاست، بابائے بلوچستان“ ذرا چشم تصور سے یہ نظارہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اگر اس وقت سیاسی کارکنان آنکھیں بند کرنے کے بجائے سوال اٹھا کر، تنقید کر کے غوث بخش بزنجو کو یہ قدم اٹھانے سے باز رکھتے تو آج بلوچ سیاست کہاں ہوتی؟ لیکن تعظیم ہمارے شعور کو خاموش کر دیتی ہے۔

سامنے تعظیم سے سر جھکائے رکھا اور سوال وتنقید کو شجر ممنوعہ سمجھتے رہے، ذرا سوچیں کہ اگر اس دوران کوئی بڑی سیاسی تحریک چلائی جاتی تو آج بلوچ مسئلہ دنیا کے سامنے کتنا مضبوط ہوتا، وہ تو بھلا ہو آغا عبدالکریم خان کا کہ انہوں نے ایک چھوٹے پیمانے کی بغاوت کر کے کم از کم پاکستانی قبضہ کو جبر تو ثابت کر دیا ورنہ پاکستانی قبضہ کو کوئی بھی جبر ماننے کو تیار نا ہوتا ۔اسی طرح جب ”استمان گل“ بنی تو وہ بھی آزادی کے واضح موقف کو آگے بڑھانے کے بجائے ون یونٹ کے خاتمے کیلئے تحریک چلانے لگی اور آگے جا کر پختونوں کے ساتھ مل کر اپنی جدا حیثیت نیپ میں کھو دیا، اگر ہر عمل پر سوال اٹھتا تو شاید سوال اٹھانے والے یہ ضرور پوچھتے کہ آزادی کے بجائے ون یونٹ توڑنے اور صوبے بنانے سے ہمارا کیا تعلق؟ ہم اپنی توانائی ان پارلیمانی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کیوں ضائع کریں اور اگر اس مطالبہ کو مان بھی لیا جاتا ہے تو بلوچ کو کیا حاصل ہوگا؟ آگے چل کر ہم نے دیکھ بھی لیا کہ ون یونٹ ٹوٹ بھی گئی اور بلوچستان کو صوبہ بنا بھی لیا گیا لیکن طوق غلامی اسی طرح گردنوں سے چمٹی رہی ۔ذرا غور کریں کہ 1954 سے لیکر 1972 تک کے ہمارے جہد کا حاصل عطاءاللہ مینگل کے 8 ماہ کی حکومت رہی، لیکن بلوچ سیاست کے اس 18 سال کو ضائع کرنے کے بعد بھی کسی نے سوال نہیں کیا بلکہ بس ہم یہی کہتے رہے کہ ”جی بگٹی، مری مینگل“۔

1960 میں بلوچ طلباء ایک تنظیم بلوچ ورنا واندہ گل کے نام سے بناتے ہیں، 1962 میں اسکا نام بدل کر بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن رکھا جاتا ہے اور پھر یہ بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن بن جاتا ہے ۔اس وقت بلوچستان سے نیپ کے قائدان بلوچ طلباء پر دباوڈالتے ہیں کہ وہ انکے پاکٹ آرگنائزیشن کی حیثیت سے کام کریں اور ان کے جھنڈے اور پوسٹر لگایا کریں لیکن وہ انکار کر دیتے ہیں ۔اسی انکار کے بعد نیپ کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں بابا خیر بخش مری، عطاءاللہ مینگل اور

حئی کو چیئرمین اور بیزن بلوچ سیکریٹری جنرل نامزد کرتے ہیں، اس کونسل سیشن کے منعقد ہوتے ہی باقی مخالف طلباء جو نیپ کی باجگواری کے حق میں نہیں ہوتے اپنا علیحدہ بی ایس او بنا کر اسے بی ایس او (اینٹی سردار) کا نام دیتے ہیں ۔یہیں سے بی ایس او کے ٹوٹ پھوٹ اور اس کے ٹکڑوں پر سیاسی پارٹیوں کے چھینا جھپٹی کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو تاحال جاری ہے ۔اسی پرشت وپروش نے بی ایس او کی افادیت آدھے سے بھی کم کر دی اور بی ایس او اپنے آدھے سے بھی زیادہ عرصہ حیات مخالف دھڑوں کی سرکوبی میں مشغول رہا ہے ۔جب بابا خیر بخش مری، غوث بخش بزنجو اور عطاءاللہ مینگل بی ایس او کو توڑ رہے تھے اگر کوئی ان پر تنقید کرتا، ان کے اس عمل پر سوال اٹھاتا، سچائی لوگوں کے سامنے رکھتا تو پھر شاید آج بی ایس او کی تاریخ کچھ زیادہ ہی سنہرے الفاظوں میں لکھی جاتی اور بی ایس او کے اوپر یہ چھینا جھپٹی کا عالم نہیں ہوتا، لیکن ہم اس وقت بھی خاموش رہے کیوں کہ ان تینوں کی شخصیت ہمیں ہمالیہ سے اونچی لگتی ہم انہیں سیاسی کارکن سمجھنے کے بجائے خدائی اوتار رکھنے والے دیوتا سمجھتے تھے، تاہم نے جراتِ سوال کی اور نا گستاخی تنقید سو بھگت رہے ہیں۔

1971 کے دوران جب پاکستان بنگلہ دیش میں مکمل پھنس چکا تھا، اس کے نوے ہزار فوجی بندی بن چکے تھے، بنگلہ دیش اپنی آزادی حاصل کرنے والا تھا، تب شاید وہ وقت بلوچ کیلئے انتہائی قیمتی تھا، اگر یہاں بلوچ بھی پاکستان کو سنبھلنے نہیں دیتے اور ایک محاذ یہاں سے بھی کھول کر آزادی کیلئے جہد شروع کر دیتے تو شاید نوید آزادی ممکنات میں شمار ہوتا، لیکن اس وقت بلوچ لیڈرشپ نیپ کے عشق میں ایسے مبتلاء تھا کہ اصل مقصد کو ہی بھولے ہوئے تھے، مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت بلوچ سیاست کے پائے کے لیڈر نواب خیر بخش مری، عطاءاللہ مینگل، نواب اکبر بگٹی اور غوث بخش بزنجو ہم نشین ہونے کے باوجود تھوڑا بھی اس پہلو پر نہیں سوچ سکے کہ

وہ تحریک آزادی کی شروعات کریں، ہوا کیا بنگلہ دیش آزادی ہوگیا اور ہماری لیڈر شپ بلوچستان کو ایک صوبے کی صورت میں پاکر گورنری اور وزیر اعلیٰ کے سیٹوں پر براجمان ہوکر ایسے جشن منانے لگے کہ جیسے بنگلہ دیش سے بڑی کامیابی انہوں نے حاصل کی ہو، ان سیٹوں کے بدلے پاکستان انہیں بس کچھ سال روکے رکھنا چاہتا تھا جیسے ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو پہلی فرصت میں ہی ہمارے ان لیڈروں کو ان کے وزیر اعلیٰ اور گورنر کے عہدوں سمیت نکال باہر کیا، پھر جا کر بلوچ لیڈر شپ کو یاد آئی کہ تحریک چلانی ہے، جنگ لڑنی ہے جو جنگ 1971 میں شروع ہونا تھا اسے 1973 میں شروع کیا گیا اور اس کا انجام کیا ہوا ہم سب بخوبی آگاہ ہیں، کاش کے 71 میں سوالوں کے انبار لگائے جاتے اور ان لیڈروں سے اتنے سوالات پوچھے جاتے کہ وہ خود کو ہمارے تقدیر کا تنہا مالک نہیں سمجھتے، کاش کے ہماری زبانوں پر شخصیت پرستی کی قفل نہیں لگی ہوتی اور ہم اتنی تنقید کرتے، اتنی تنقید کرتے کہ ہمارے لیڈر شپ کی نیندیں حرام ہو جاتی، لیکن ہم ایسے مہر بہ لب تھے کہ ہمارے سکوت کو قسمت کے پھوٹنے کی آواز بھی نا توڑ پائی۔ قصہ یہیں تمام نہیں ہوتا ہماری خاموشی تو یہاں سے افغانستان جانے اور وہاں سے واپس آنے تک قائم رہی، حتیٰ کے وہ سوال جو تب پوچھنے چاہیے تھے آج تک تشنہ لب ہیں، محترم لیڈران یہاں سے آپ افغانستان بلوچ بن کر گئے تھے پھر واپس گزینی اور بجارانی بن کر کیونکر لوٹے؟ آج کے ہمارے سیاسی بت اور قد آور شخصیات بابا خیر بخش مری، میر عبدالنبی بنگلزئی، میر محمد علی تالپور وغیرہ جیسے لوگ اتنے سال افغانستان میں رہنے کے بعد بلوچوں کیلئے کیا بنا کر لائے؟ میر ہزار خان بجارانی کو یہاں سے آپ کمانڈر انچیف بنا کر اپنے ساتھ لے گئے لیکن واپسی پر وہ غدار کن وجوہات پر بنا؟ بابو شیرو جیسا عظیم شخص وہاں سے لوٹا تو پھر گوشہ نشین کس کی وجہ سے ہوئے؟ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب گزینی، بجارانی مسئلہ چل رہا تھا تو بابو شیرو آخر تک نواب خیر بخش کے پہلو میں بیٹھے رہے اور ہزار خان پر بابا خیر بخش کو ترجیح دی لیکن بابا خیر بخش نے ایک بار اس سے بات تک نہیں کی۔ اگر ماضی میں یہ ”کیوں“ پوچھے جاتے تو شاید آج ہم اپنی ہی زمین پر ”کون“ بننے کے دہانے پر کھڑے نہیں ہوتے۔

1980 تک غوث بخش بزنجو بلوچ سیاست میں ”بابا“ کی حیثیت رکھتے تھے، حیدرآباد جیل سے رہائی کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا کہ غوث بخش بزنجو اور عطاء اللہ مینگل و بابا خیر بخش مری کی راہیں جدا ہو گئیں، غوث بخش بزنجو جیل سے چھوٹنے کے بعد اپنے تمام سیاسی رفیقوں کو جمع کر کے اپنا سخت گیر موقف یکسر بدل کر پاکستان نیشنل پارٹی بنا بیٹھے اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست شروع کر دی اور اس وقت کے صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل رحیم الدین خان کی آشیرباد لیکر اسٹیبلشمنٹ کی منظور نظر جماعت بن گئی اور پھر ہر حکومت میں حصہ لیکر آج کے نیشنل پارٹی اور ڈاکٹر مالک کی بنیاد رکھ دی۔ وہ بلوچ سیاست جس کے نظریہ پر کٹر پن، سخت گیر موقف اور بکنے سے انکاری ہونے پر یہ پورا خطہ رشک کرتا تھا پاکستان نیشنل پارٹی کے بننے کے بعد ایک ایسے گٹر میں بدلنے لگی جس کے تعفن سے لوگ دور بھاگنے لگے۔ یہ فلسفہ کہ سیاست کا مقصد پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کرنا ہے اسی پی این پی کی بلوچ سیاست کو دین ہے، لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اپنے اس طویل موقف کو بدلنے پر غوث بخش بزنجو کو کئی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، نا کسی نے یہ سوال پوچھا کہ جناب آپ وہی شخص ہیں جس نے سب سے پہلے پاکستان سے الحاق کی مخالفت کی تھی اب آپ کس بنیاد پر پاکستانی وفاق کی سیاست شروع کر بیٹھے ہیں؟ اور نا ہی کسی نے ان پر تنقید کر کے انکی قلعی کھولی۔ غوث بخش بزنجو بلوچ سیاست میں موقع پرستی، چاپلوسی، باجگواری، بکاؤ پن کا زہر گھولتے رہے اور ہم کہتے رہے کہ ”میر غوث بخش بابائے سیاست، بابائے بلوچستان“ ذرا چشم تصور سے یہ نظارہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اگر اس وقت سیاسی کارکنان آنکھیں بند کرنے کے بجائے سوال اٹھا کر تنقید کر کے غوث بخش بزنجو کو یہ قدم اٹھانے سے باز رکھتے تو آج بلوچ سیاست کہاں ہوتی؟ لیکن تعظیم ہمارے شعور کو خاموش کر دیتی ہے۔

بلوچ سیاست جس کے نظریہ پر کٹر پن، سخت گیر موقف اور بکنے سے انکاری ہونے پر یہ پورا خطہ رشک کرتا تھا پاکستان نیشنل پارٹی کے بننے کے بعد ایک ایسے گٹر میں بدلنے لگی جس کے تعفن سے لوگ دور بھاگنے لگے

1987 میں بی ایس او کے فارغ شدہ لیڈروں نے بی این وائی ایم کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کا مقصد بلوچ یوتھ کو منظم اور متحرک کرنا تھا۔ سنا ہے اس کے قیام میں فدا بلوچ شہید جیسے لیڈروں نے بڑا کردار ادا کیا، اصل میں یہ پاکستان نیشنل پارٹی سے ہی ٹوٹ کر بنی۔ پاکستان نیشنل پارٹی نے بلوچ سیاست کو جس گندگی میں بدل دیا بی این وائی ایم ایسے موقع پر ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا، یہ پورے بلوچستان میں مقبول ہونے لگی، اس کی جڑیں بلوچ عوام میں پھیل گئی، چونکہ اس وقت بلوچستان میں پارلیمانی سیاست کا دور شروع ہو چکا تھا بی این وائی ایم نے بھی پارلیمانی سیاست میں حصہ لیا لیکن وہاں بھی وزارتوں کے بجائے اپوزیشن کا کردار ادا کر کے اس نے بلوچ عوام میں جڑیں قائم رکھیں اور بہت جلد انہوں نے نواب اکبر بگٹی اور عطاء اللہ مینگل کو اعتماد میں لیکر ایک الائنس بلوچستان نیشنل الائنس بھی بنا دی، اسکی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے آپ لگا سکتے ہیں کہ اس نے اپنے قیام کے ایک سال بعد ہی غوث بخش بزنجو کے پی این پی کو 1988 کے الیکشنوں میں پچھاڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بی این وائی ایم اپنی تئیں انقلابی عنصر رکھتا تھا گو کہ وہ پارلیمانی سیاست کا

حصہ تھا لیکن اس وقت کے حالات کے مطابق دیکھا جائے تو سب سے سیدھا اور کٹر موقف بی این وائی ایم رکھتا تھا، لیکن فدا بلوچ کے شہادت کے بعد ڈاکٹر حئی اور ڈاکٹر مالک جیسے لوگوں نے 1989 میں اس کے سالانہ کنونشن کے دوران اسکا نام بدل کر اسے بی این ایم بنا دیا اور اسے ایک مکمل پارلیمانی سیاسی پارٹی ڈکلیئر کر دیا، اس عمل نے بعدازاں بلوچ سیاست میں بچے ہوئے رمق بھر انقلابی پن کا بھی گلہ دبا دیا لیکن حیران کن حد تک سابقہ ریکارڈ چھاننے کے باوجود مجھے ایسا کوئی مواد نہیں مل رہا کہ جس سے ظاہر ہو کہ بی این وائی ایم کو کٹر پارلیمانی جماعت بی این ایم بنانے کے خلاف نوجوانوں نے سوالوں اور تنقید کی بوچھاڑ کی ہو، یا اپنے قلم وزبان سے احتجاج کیا ہو اب دیکھیں کہ اس خاموشی کا ہمیں بعدازاں کیا خمیازہ بھگتنا پڑا کہ 1990 سے 2000 تک بلوچ سیاست مراعات کیلئے کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا ،بی این ایم (حق)،بی این ایم (مینگل)، بی این پی ،پراگریسیو نیشنل موومنٹ، جمہوری وطن پارٹی ،پھر مزید تقسیم کے بعد بی این پی مینگل، بی این پی عوامی، بلوچستان نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، نیشنل پارٹی وغیرہ وغیرہ میں بٹ کر اپنا مقصد صرف مراعات، وزارت اور امارت بنا دی۔اس دوران یہ حکومتوں میں رہنے کیلئے ہر موقع کا فائدہ اٹھاتے رہے اور حیران کن حد تک یہ بلوچ عوام میں پھر بھی ہیرو ہی رہے اور حتیٰ کہ آج تک انکے اس اثر انگیزی سے کئی لوگ عملاً اور کئی انقلابی لیڈران تو نفسیاتی طور پر آزاد نہیں ہوئے۔ ذرا غور کریں کہ 1990 سے لیکر 2000 تک ہماری خاموشی نے جس پلید ترین سیاسی دور کو جنم دیا بعد میں اس کا انجام اس وقت ہوا جب بلوچ نوجوانوں نے ان پر تنقید شروع کی، ان کے کردار اور اعمال پر سوال اٹھانے لگے۔ جب ان پر سوال اٹھنے لگے تو ان کی حیثیت ظاہر ہونے لگی اور نوجوان انکا ساتھ چھوڑ کر تحریک آزادی اور انقلابی سیاست سے جڑنے لگے، اب ذرا تخیل کے گھوڑے کو دوبارہ دوڑا کر دیکھیں کہ اگر 2001 میں بلوچ یکجہتی کو مدنظر رکھ کر ان پارلیمنٹ پرست سیاست دانوں پر اس لیئے تنقید نہیں ہوتا کیونکہ وہ بلوچ ہیں اور قوم پرست (نام نہاد) ہیں تو آج صورتحال کیا 90 کے دہائی سے مختلف ہوتی؟ نہیں ہمارے تنقید و سوالوں نے ہی ہمارے سیاست کی پوری رنگ و ڈھنگ بدل دی حتیٰ کے آج سوال وتنقید سے سب سے زیادہ خائف لیڈر ڈاکٹر اللہ نظر کو کوئی مقام حاصل ہے تو اس کا بنیادی سبب ہی یہی ہے کہ اس وقت خود ڈاکٹر سوال و تنقید کرنے میں پیش پیش تھے۔بلوچ سیاسی تاریخ اتنی طویل ہے کہ اس کو مکمل یہاں کھول کر نہیں رکھی جا سکتی لیکن ان چیدہ واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آج ہمیں سوال کے نام سے جس طرح ڈرایا جاتا ہے، تنقید کو جس طرح ایک مانع عمل قرار دیا جا رہا ہے ان میں کوئی سچائی نہیں، ہماری پہلے نسلیں سوال وتنقید سے اس لیئے بھاگتے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ وہ اکیلا رہ جائیں گے، لوگ ان پر ہنسیں گے انہیں پاگل، ایجنٹ اور ردِ انقلابی کہیں گے، انہیں برا بھلا کہا جائے گا قد آور لیڈروں کے سامنے ان کی بات جا کر چھوٹی منہ بڑی بات بن جائے گی۔ان کے اس مصلحت پسندی کا جو خمیازہ ہمیں من حیث القوم بھگتنا پڑا اس کی جھلک میں نے پیش کرنے کی کوشش کی۔سیاست ایک ارتقائی عمل ہے بہتے پانی کی طرح ہے یہ وقت وحالات کے ساتھ جدت کا طلبگار ہوتا ہے، جس طرح بہتے پانی کا رستہ روک لیں تو وہ جوہڑ بن جاتا ہے اسی طرح سیاست خاص طور پر انقلابی سیاست میں اگر نئے خیالات اور جدت کو روکا جائے تو یہ بھی اپنے اندر گندگی جمع کرنے لگتا ہے۔ میں نے اس مضمون کے شروع میں کچھ ایسے عوامل بیان کیئے جو ہمارے بلوچ سیاست میں دوبارہ گندگی جمع کر رہے ہیں، بلوچ سیاست دوبارہ جدت کا متقاضی ہے، تبدیلی کا خواہاں ہے لیکن ہمیشہ کی طرح آج بھی انقلابی کے نقاب میں کچھ قد آور لیڈر جو اسی موجودہ طرز سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اس جدت کو روکنا چاہتے ہیں، لیکن اس بار ہم بہت آگے نکل چکے ہیں اب کے بار بلوچ تحریک خاموشی کے صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گی اور گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اس لیئے اب ہمیں اپنے پچھلے نسلوں کی طرح خاموش ہونے کے بجائے ہر عمل پر سوال اٹھانا ہے، ہر غلطی پر تنقید کرنا ہے، شخصیت پرستی کے آسیب سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے اور اپنے حالات کا بہترین تجزیہ کر کے نئی راہیں تلاش کرنی ہیں، جدید دنیا کے تقاضوں سے تحریک کو ہم آہنگ کر کے اس میں نئی روح پھونکنی ہے، گو کہ اس سفر میں تنہا رہنے، نشانہ تضحیک ودشنام بننے، غداری کے تمغے پانے کے خدشات ہمیشہ ہمارے سروں پر منڈلاتے رہیں گے لیکن اب کے بار مصلحت پسندی کے بجائے ہمیں اپنی خودی قربان کر کے وہ غلطیاں نہیں دہرانی ہیں جو ہمارے پیش رو دہرا چکے ہیں۔

ایک دانشور جان ڈوی کہتے ہیں کہ ''ہم ماضی کے تجربوں سے نہیں سیکھتے بلکہ ان تجربوں پر غور کرنے سے سیکھتے ہیں'' __________!

اب کے بار بلوچ تحریک خاموشی کے صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گی اور گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اس لیئے اب ہمیں اپنے پچھلے نسلوں کی طرح خاموش ہونے کے بجائے ہر عمل پر سوال اٹھانا ہے، ہر غلطی پر تنقید کرنا ہے، شخصیت پرستی کے آسیب سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے اور اپنے حالات کا بہترین تجزیہ کر کے نئی راہیں تلاش کرنی ہیں، جدید دنیا کے تقاضوں سے تحریک کو ہم آہنگ کر کے اس میں نئی روح پھونکنی ہے

اتحاد کا نعرہِ مستانہ

(آؤ مل کر لب سی لیں)

تحریر۔زامر بلوچ

تحریکی جدوجہد کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ایک بہت ہی عظیم خواہش ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے خلاف اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ صف آرا ہو کر اپنی مقصد کی آبیاری کریں، وہ اس مقصد کو پانے کی خاطر اپنی جان سے بھی گزرنے کو تیار ہوتا ہے، وہ لڑتا ہے، اپنی زندگی اور خواہشات سمیت مادی دنیا کی بہت ساری میلانات ورجحانات کو تیاگ کر وہ قومی بقا کے مقصد کی حصول کو باقی سب باتوں پر ترجیح دیتا ہے، ان سب میں سے عظیم اوردل آویز نعرہ اتحاد کا ہے، مگر اپنی تمام تر مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد بھی انسان کبھی ایک متفقہ نقطۂ نظر پا سکتے نہ رہے، انسان سوچتا ہے اور وہ زندہ ہے، ہر انسان اپنی حساب سے اور اپنی ذاتی و باہری دنیا کے تجربات کے رو سے اپنی خیالات کو ایک رخ دیتا ہے، لہٰذا یہ لازمی ہے ہر انسان کے دل و دماغ میں گردش کرنے والے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں، سمجھ بوجھ کت اعتبار سے، تجربات کے لحاظ سے یا پھر اخلاصِ عمل کے معنوں میں مگر ذہنی امتیاز بہرحال تاریخی عمل کا خاصہ رہا ہے اور اسی وجہ سے دنیا مسلسل پس سے پیش کی جانب محوِ سفر ہے لہٰذا ہم بحیثیت بلوچ اتحاد اور ٹکڑیوں میں بٹ کر دشمن کے خلاف منظم جدوجہد کی چناؤ میں کون سے طریقہ پر عمل کرنا پسند کریں گے، ایک تنظیم میں شامل لوگ ایک ہی اکائی میں رہ کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہر گزرتے لمحے شکایت پر مبنی اپنی خیالات کا اظہار کرتے ہیں لوگ اپنی ذہنی استعداد سے اپنی حکمت عملیاں بنا کر اسے پیش کرتے ہیں اس پر بحث کرتے ہیں اور پھر دوسرے لوگ انکی پالیسیوں کے خلاف دلائل دے کر انہیں رد کرتے ہیں ایک ہی تنظیم میں رد و قبول کا سلسلہ تا حیات تسلسل سے چلتا رہتا ہے، ایسا نہیں کہ ہم ایک تنظیم سے وابستہ ہیں تو ہمیں بس چپ رہنا ہی لازمی ہے اگر ایسا ہے تو ہماری وجود کی اہمیت کیا ہوگی کیا ہم صرف یہ دکھانے پر مصر ہیں کہ ہماری پالیسیاں مرکزیت کے بھرپور مظہر ہیں بھلے ان میں زمینی حقائق سے میل ہو کہ نہ ہو، اتحاد کی بنیادی ضرورت ایک مقصد کو حاصل کرنا ہے اور وہ مقصد کیا ہے اور اسکی جہتیں کیا ہیں طویل المعیاد تزویراتی طریقہ کار کیسے ہم آہنگ ہو سکتی ہے، ہم اپنی مثال لے لیں کیا ہمارے لیئے پاکستان اور ایران سے چھٹکارہ پانا ہی مقصد ہے، کیا ہمارے لیئے قبضہ گیری کی انخلا مقصد ہے، کیا ہمارے لیئے لوگوں کی جم غفیر لگانا مقصد ہے یا پھر اتنی تعداد میں جانیں نچھاور کر کے ہم ایک ایسی مقصد پہ گامزن ہیں جو صرف ایک آزاد مملکت کے قیام سے بہت آگے کی چیز ہے، مثلاً ہم ہر غریب کو یہ باور کراتے ہیں کہ استحصالی نظام سے چھٹکارہ پا کر ہم مقابلتاً ایک برابری کی بنیادوں پہ استوار ریاست قائم کریں گے، انسانی حقوق، جمہوری رائے، اختلاف رائے، تعلیم اور سماجی، معاشی، سیاسی فنی اور مذہبی آزادی کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ کہ جس کا ہم ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے لوگوں کو نوید سناتے ہیں، نواب خیر بخش کہتے ہیں کہ "مجھے ڈر ہے کہ سروں کی قربانیاں غریبوں کے بچے دیں اور آزادی کے ثمرات کسی اور کے جولی میں جا گریں" مقصد کوئی اتنی بھی چھوٹی چیز نہیں کہ جسے ہم شوقیہ انداز اور جوش جوانی میں صرف آزادی کی حصول تک محدود کر دیں۔لہٰذا یہ امر واضح ہو جاتا کہ ہم صرف جذباتی بنیادوں پر اتحاد کے نعروں کے علاوہ اپنی تمام تر حکمت عملیوں کو مستقبل کی عظیم مقصد سے منتج کر لیں تو نتائج کی حصول قدرے آسان اور لاابالیوں کی امکانات قدرے کم ہونگی، آخر اتحاد ایک نعرہ تو نہیں ہے اتحاد ایک قومی جدوجہد کی منزل کے لیئے کی جانے والی اقدامات میں سے ایک ہے ہم اپنے اس مختصر سیاسی دورانیے میں کتنے ایسی باتیں رد کر چکے ہیں جو کہ ہمارے معروضی حقائق کے برخلاف ہیں اگر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جن بنیادوں پر استوار کر کے ماضی میں اتحادیں بنائی گئیں تو وہ کس طرح معمولی نوعیت کی بدگمانی سے پارہ پارہ ہو گئیں اصل میں بدگمانیوں کا یہ سلسلہ پوری تاریخ کا ایک حصہ ہے جس سے آنکھیں چرائی گئیں تھیں وہ اس پورے انقلابی عمل کے بنیادی جڑوں میں پہلے موجود ہیں اور وقتاً فوقتاً سر اٹھاتے رہتے ہیں تو ایک بار پھر انہی بنیادوں پر کھڑے ہو کر ہم اگر اتحاد کی طرف جائیں بھی تو نتیجہ کیا نکلے گا وہ ہماری ماضی کی تجربات سے کھلی کتاب کی مانند واضح اور شفاف ہے، اب ہر طرف یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ آؤ اتحاد کر لیتے ہیں تمام ماضی کو بھلا کر ایک نئی اتحاد کی بنیاد ڈالتے ہیں تو کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ ماضی میں جو اتحاد بنے اور جس طرح ٹوٹے کیا وہ تمام عوامل کا سدباب کیا جا چکا اگر نہیں تو پھر انہی عوامل کو لیکر ایک بار پھر ہمارے اتحاد کا شیرازہ نہیں بکھرے گا، یہ بنیادی طور پر حقیقی سوالات ہیں جو کہ ہم اپنے ذہنوں سے مستعار نہیں لے رہے بلکہ ان تمام تجربات سے

> **ہمارے سماج کے اندرونی سیاسی صفوں میں سیاسی تعلیم کافی حد تک کم ہے اس لیئے ہم بہت ساری چیزوں کو انکی سطحی شکلوں میں قبول کرتے ہیں**

اخذ کیئے ہوئے خدشات ہیں جو کہ پچھلے 15 برس سے تحریکی جد وجہد کی صفوں میں سے ہم دیکھتے آرہے ہیں، مگر اب یہ سوالات کسی حد تک متنازعہ بنا کر غیر مطلق بنا دیئے گئے ہیں، میں شاید ہر بار اپنی اس بات کا اعادہ ضرور کروں گا کہ ہمارے سماج کے اندرونی سیاسی صفوں میں سیاسی تعلیم کافی حد تک کم ہے اس لیئے ہم بہت ساری چیزوں کو انکی سطحی شکلوں میں قبول کرتے ہیں اسکی بنیادی مثال اتحاد کے دل فریب نعرہ ہے بحیثیت سیاسی کیڈر ہم کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم اس جنگی وسیاسی تسلسل میں سرزد ہونے والے کسی بھی عوامل کو محض ایک جہت سے نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہمیں ایسا کرنا چاہیئے بلکہ سیاسی وجنگی عوامل اور انکی باریکیاں کئی جہتوں پر انحصار کرتے ہیں اور ان تمام باتوں کی موجودہی نہیں لیکن ہوا یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت ہی نرالے طریقے اپنائے گئے، جو نہ سیاسی ہیں نہ سائنسی ہیں اور نہ ہی انقلابی ہیں بلکہ کرید کر دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ انقلاب کی بھیس میں چھپی خالصتاً قبائلی طریقے ہیں جو کہ انقلابی اصولوں کے متوازی کھڑے کیئے جارہے ہیں اور دونوں کا آپس میں ایک فطری ٹکراو ہے اور لوگ اسکو نہ سمجھتے ہوئے فیصلہ لینے سے قاصر ہیں اور اوپر سے گلہ بھی کرتے ہیں کہ رد انقلابی رویوں نے ہمارے تحریک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے یہاں بھی قصہ کچھ مختلف نہیں اب رد انقلابی سے کیا مراد لیا جارہا ہے؟؟؟؟؟ دراصل سوال کو منتقل کرنے کا یہ رد انقلابی طریقہ ہے کہ آج جس طرح سے لوگ ہم سے سوال پر سوال کرتے جارہے

،اگر بلوچ سماج میں بسنے والے جہد کار سوال کرنے کے پاداش میں قابل گردن زدنی ٹھہر گئے ہیں تو پھر اس اتحاد کے تمام خد وخال واضح ہیں اور خاکم بدہن اس کی خدوخال سے خون کی بو بھی آتی محسوس ہورہی ہے، اسی لیئے جب چیزوں پر غور فکر شروع ہوگی تو ان پر سوالات اٹھائے جائیں گے اور سوالات یا تو رد ہونگے یا پھر قبول ہو کر اپنی منطقی انجام تک پہنچیں گے اسکے علاوہ اور کوئی درمیان کا راستہ موجود ہی نہیں

ادراک کرنے کے بعد ہم پر یہ بھید کھل جاتی ہے کہ کیا چیز صحیح اور کیا غلط، لہٰذا ہر عمل کے صحت کو متعین کرنے سے پہلے اس کے تمام منفی و مثبت پہلووں سمیت اس عمل سے جڑے ماضی کی تجربات کو نظر میں رکھنا ہمارے لیئے امر مجبوری ہوگا، اتحاد کا نعرہ چلو سر آنکھوں پر مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کونسی مشترکہ محاذ ہے کہ جس پر کاربند رہ کر ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونا ہے کیا مستقبل میں آپکو ایک مشترکہ محاذ پوری دنیا کی طاقتوں سے نمٹنے اور گفت شنید کے لیئے نہیں چاہیے؟ کیا ہمیں بلوچ سماج کو ایک مکمل جدید سماج بنانے کی خاطر صرف آزادی کی حصول کے علاوہ قبائلی ذہنیت ورویوں کو تبدیل کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیئے؟ اگر چاہیے تو اس عظیم مقصد کے پیش نظر کیا ہمیں ایسے پا بجولاں اتحاد کی ضرورت ہے کہ جو ہماری اپنی اندرونی مسائل سے پہلوتہی کرنے کے واسطے تخلیق پا رہی ہو؟ اتحاد مقصد سے جڑی ہے یا پھر ردِ عمل کی کیفیت سے سرشار ہے؟ اگر دشمن بلوچ قوم اور بلوچ سماج و سیاست سے جڑے وہ سولات ہیں کہ جو تحریک کی مستقبل کو سنوارنے کے لیئے اٹھائے جارہے ہیں تو پھر اس اتحاد کا تک ضرور بنتا ہے کہ ایک اتحاد اپنے سیاسی غیر مطمئن ذہنوں کے خلاف بنایا جارہا ہے، اگر بلوچ سماج میں بسنے والے جہد کار سوال کرنے کے پاداش میں قابل گردن زدنی ٹھہر گئے ہیں تو پھر اس اتحاد کے تمام خد وخال واضح ہیں اور خاکم بدہن اس کی خدوخال سے خون کی بو بھی آتی محسوس ہورہی ہے، اسی لیئے جب چیزوں پر غور فکر شروع ہوگی تو ان پر سوالات اٹھائے جائیں گے اور سوالات یا تو رد ہونگے یا پھر قبول ہو کر اپنی منطقی انجام تک پہنچیں گے اسکے علاوہ اور کوئی درمیان کا راستہ ہیں تو کیوں نہ ہم ان سوالوں کو گھما پھرا کر ایک اور جانب منتقل نہ کردیں، یہ ایک نہایت گندی سیاست اور موقع پرستانہ عمل ہے، اس عمل کے نتیجے میں اصل مدعا سے اکثر لوگوں کی سوچ کو کسی اور جانب ہٹایا جاتا ہے جو کہ عموماً پاکستانی طرز سیاست میں دیکھنے کو ملتی ہے جہاں ہر مسئلے کوئی اور نیا مسئلہ آکر دفن کرتا ہے اور خود آج پاکستان انہیں تضادات کی ایک قبرستان کا منظر پیش کررہا ہے، اسکی جھلک ہماری سیاست کچھ اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص گرفتار ہو جاتا ہے تو ہم انکی نام کے واسطے دیکر کہتے ہیں کہ آؤ اتحاد کرلیں اگر کوئی اس راہ کارزار میں شہید ہو جائے تو ہم اس کی شہادت کو ڈھال بنا کر اسے لوگوں کی جذبات کو ورغلانے کا کام لیتے ہیں مگر کیا جب ایک انسان جدوجہد شروع کرتا ہے اور اسکے مختلف مراحل میں گزرتا ہوا کئی ایک پہلووں کو بچشم خود مشاہدہ کرچکا ہو تو اسے یہ احساس نہیں ہوگا کہ کل کو شاید ہم سے کوئی دشمن کے ہتھے چڑھ جائے اور کوئی شہید ہو جائے یا پھر دشمن پینترا بدل کر غالب آجائے یہ ساری چیزیں پہلے سے زہنوں میں موجود ہیں لہٰذا اب کسی ایسے سانحے یا حادثے کو بنیاد بنا کر ہم یہ نہیں کرسکتے کہ اس سے ہم تمام ماضی کی کرتوتوں اور خامیوں کو بھول کر ایک نئی راہ محض اس لئے اختیار کریں کہ ہم اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، دراصل سانحات وواقعات سے پہلے اور اسکے اثرات کے ختم جانے کے بعد کی جو سوچ اور ذہنی محور ہوگا وہ حقیقی ہوگا کیونکہ سیاسی نابالیدہ پن کی وجہ سے ہمارے بیشتر لوگ سانحات وواقعات کی اثرات کو مغلوب نہیں کرسکتے اور ان اثرات کے زد میں باآسانی آجاتے ہیں اور ایسے میں اس تمام صورتحال کا فائدہ اٹھانا ایک گھناونا سیاسی عمل ہے، اور جب عام عوام سوال کرتے

ہیں اور پوچھتے ہیں کہ مسائل کیوں موجود ہیں، وجوہات اسباب وعلل کو معلوم کرنے کے لیئے جب زور دیتے ہیں تو دباو میں آ کر اتحاد کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے،انکو یہ دکھا کر یقین دلایا جاتا ہے کہ دیکھو کس طرح سے لوگ ہماری باتوں اور منتوں کو رد کرتے ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتے ہم تو چاہتے ہیں کہ سب کچھ صحیح ہو مگر وہ لوگ نہیں چاہتے،اب وہ ان کو یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ خود فیصلہ کر لو کہ غلط کون اور صحیح کون،اصل میں یہ نوآبادیاتی طریقہ کار کی بالکل عین ایک دوسری شکل ہے، مثلاً ہم دیکھ چکے ہیں کہ نوآبادیات کی پوری تاریخ کس طرح گزران وقت کی حکمت عملیوں پر عمل پیرا ہوتا ہے، نوآبادیاتی حاکم کبھی اصل مدعے پہ نہیں آتا کہ میں قبضہ گیر ہوں اور اصل مسئلہ میری یہاں موجد گی ہے وہ صرف ثانوی ترجیحات پر بات کرتا ہے،عوام اٹھتے ہیں تو انہیں مراعات نوکری گھر گاڑی بنگلہ بینک بیلنس وزارت زمین اور خرچہ جاتی سبسڈی دی جاتی ہیں تاکہ ذہن میں اٹھنے والی اس سوچ کو خطرناک حد تک بڑھنے سے روکا جا سکے، مثال کے طور پر فرض کرلیں کہ ایک بھوکے کی حصہ کی کھانے کی مد میں 2000 روپے آتے ہوں مگر انکو کسی بھی طرح سے روکا جاتا ہے تا وقتیکہ کہ وہ تنگ آمد بہ جنگ آمد والی بات کو

اور اس چیز کا تعین ہونا لازمی ہے اور اسی غیر سیاسی پن کی وجہ سے ہم اتحاد کی لفاظیت کے دام میں کئی بار گرنے کے باوجود اس بات پر سوچنے سے قاصر ہیں کہ ماضی کی اتحادوں اور اتحادیوں کا کیا حشر نشر ہوا اور کیوں ہوا،کس کی وجہ سے ہوا، کسی کی کردار اور ان میں موجود خصلتوں کی تعین کرنے کی بجائے ہم میں قبائلی احترام کا جذبہ اور روحانی عقیدت کا رویہ انقلابی و سائنسی نظریوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں، بہرحال اتحاد کی سائنسی و انقلابی اصولوں سے کوئی انکار نہیں مگر اتحاد کی سحر انگیز نعرے کا مقصد کے ساتھ کس حد تک باہم جوڑ ہے یا نہیں یہ بنیادی سوال ہے، اگر اتحاد محض اس لیئے کیا جائے کہ غلطیوں کی پردہ پوشی کی امکانات کچھ بڑھ جائیں،اور ”من ترا ملا بگویم تو مرا قاضی بگو“ کے مصداق صرف سطحی میلانات پر اتحاد کی نام کو پراگندہ کیا جائے تو میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ پھر اصولوں کی نفاذ کہاں پر ہوگی، غریب اور دہقان کی دادرسی کون کریگا، حق اور باطل کا تعین کیونکر ہوگا،اور تو اور آزادی اور غلامی کی بنیادی بندھنوں میں امتیازی وصف کیا ہوگی، قبضہ گیر کا رہنا اور نکلنا آزادی کی بنیادی شرطیں ہونگی، اور ہاں کسی بھی ایسی بے تکی لفاظیت سے ہماری تحریک کی طویل المعیاد مقاصد کو حاصل

اتحاد کی سائنسی و انقلابی اصولوں سے کوئی انکار نہیں مگر اتحاد کی سحر انگیز نعرے کا مقصد کے ساتھ کس حد تک باہم جوڑ ہے یا نہیں یہ بنیادی سوال ہے، اگر اتحاد محض اس لیئے کیا جائے کہ غلطیوں کی پردہ پوشی کی امکانات کچھ بڑھ جائیں،اور ”من ترا ملا بگویم تو مرا قاضی بگو“ کے مصداق صرف سطحی میلانات پر اتحاد کی نام کو پراگندہ کیا جائے تو میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ پھر اصولوں کی نفاذ کہاں پر ہوگی، غریب اور دہقان کی دادرسی کون کریگا، حق اور باطل کا تعین کیونکر ہوگا،اور تو اور آزادی اور غلامی کی بنیادی بندھنوں میں امتیازی وصف کیا ہوگی

پہنچے تو کیا ہوتا ہے ان 2000 میں سے 100 تھما دیئے جاتے ہیں تاکہ بھوک اور تشدد کے درمیان جو خطرناک ذہنی ہم آہنگی تشکیل پا رہی ہے اسے ختم کیا جا سکے اور وہ بھوکا شخص بخوشی 100 روپے کو قبول کرتا ہے، کیونکہ یہ سو روپے اسکی متشدد میلانات کو غارت کرنے کو کافی ہیں اور یہ اس کو گرم مزاجی سے سیدھا ٹھنڈک میں تبدیل کر دیتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ اصل مسئلہ میرے لیئے سو روپے نہیں بلکہ وہ پورے دو ہزار ہیں جو کہ مرا بنیادی حق ہے مجھے ملنی چاہئیں، اسی طرح ہمارے لوگ اسی نوآبادیاتی حربے کو مختلف شکلوں میں سرانجام دے رہے ہیں سوالوں کی اہمیت کو گھٹانے کی خاطر نئے حربے اور نعرے آزمائے جا رہے ہیں۔

بلوچ سیاست میں بوجوہ سیاسی عمل کو غارت کیا گیا، آج کا یہ سب تحریکی نشیب فراز کا مرحلہ جو ہم پر گزر رہا ہے اسی غیر سیاسی ماحول کی دین ہے،اور اس غیر سیاسی ماحول کی نشو نما محض ایک فریق نے نہیں بلکہ دانستہ وغیر دانستہ سارے فریق اس میں شامل ہیں

کرنے میں کس حد تک کامیابی امکانات پیدا کیئے جا سکتے ہیں، اگر ان تمام سوالوں کا جواب کسی ایسے اتحاد میں موجود نہیں ہیں جو کہ مقصد سے عاری ہو تو بھلا اسکے ثمرات سے ہم کیا توقع رکھ لیں اور کیوں رکھ لیں۔ فیصلہ آپکا اور آنے والا کل بھی آپکا ------- بلوچی میں ایک معقولہ ہے کہ ”مردم ھدا یا نہ گندیت بلے کدرتانی گندیت ------ لہذا سوچو کیونکہ سوچنا زندگی کی نشانی ہے ----- اور زندگی قوت تحریک کا دوسرا نام ہے ----------- اور تحریک سے انقلاب بپا ہوتے ہیں ---

===========================

جمہورانحراف جنگ — تحریر: اسلم بلوچ

جنگ تمام مسائل کا حل نہیں ہوتا، لیکن مسائل کو حل کی جانب لے جانے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوچکا ہے،

کہتے ہیں کہ جنگ تمام مسائل کا حل نہیں ہوتا، واقعی ایسا ہی ہوگا لیکن یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جنگ مسائل کو حل کی جانب لے جانے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوچکا ہے، بلوچ بحیثیت قوم آج جن مسائل میں گرا نظر آتا ہے ان میں سب سے بنیادی اور اہم مسئلہ بلوچ قومی سوال ہے جو باقی تمام چھوٹے بڑے مسائل کو جنم دینے کے ساتھ ہی ساتھ انکے لئے ہمارے (بلوچوں کے) جدوجہد کو ٹھوس بنیاد اور جائز جواز بھی مہیا کررہا ہے تو جدوجہد کیلئے مختلف راہیں متعین کرنا اس حقیقی تجزیے کے صداقت پر منحصر ہوگا جس کا تعلق مکمل طور پر ان زمینی حقائق سے ہوں، جن کا ہم بحیثیت قوم سامنا کررہے ہیں، یعنی اپنے دشمن کی پہچان، کہ وہ تاریخی، سماجی ونفسیاتی حوالے سے کیا، دشمن کی طاقت، اقتصادی، فوجی، سیاسی، اسکا نظام، فوجی جمہوری یا مذہبی اسکی پالیساں، دھوکے، فریب، بربریت، اسکے دوست اور دشمن وغیرہ وغیرہ، دوسری طرف اپنی حقیقت بحیثیت قوم تاریخی حوالے سے ہمارا سماجی ڈھانچہ، نفسیاتی، سیاسی، شعوری پختگی، ہماری طاقت، فوجی وسیاسی کمزوریاں ہمارے دوست ودشمن وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ۔ ساتھ ہی ساتھ سب سے بڑھکر آپ کے تاریخی تجربات آپکو راہیں متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اسی لئے تو بنیادی حقیقت اس جاری تسلسل سے تعلق رکھتا ہے، جو آپ اور آپ کے دشمن کے بیچ اپنے تاریخی حیثیت کولیکر ہمیشہ سے جاری رہتا ہے، آپ اس تسلسل کو فراموش کرہی نہیں سکتے، اس بات کو غور ومد نظر رکھنا چاہیے کہ

پارلیمانی پارٹیوں کی طرز پر دور دراز علاقوں سے تعلقات کی بنیاد پر لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح گاڑیوں میں بھر کر لانا اور کئی مقامات پر لوگوں کو بلوچیت کا واسطہ اور بلوچی غیرت کا شغان دے کر جلسے جلوسوں میں شرکت کرانا ایک ایسا مجمع اور تماشہ ہوسکتا ہے جسے کسی کو دکھایا جاسکے لیکن اس پر بغلیں بجا کر کامیابی کی نوید سنانا بے بنیاد لفاظی اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے سوا کیا ہوسکتا ہے،

وقت وحالات کے مطابق دشمن کے اپنے اندرونی وہ مسائل جنکی وجہ سے آپ کے بارے بنائے جانے والی پالیسوں میں کوئی رود بدل، یا معمولی بدلاو نظر آتا ہے، اسمیں آپ کیلئے کچھ خاص نہیں ہوتا جسکو لیکر آپ اپنے حقیقی جدوجہد کے تسلسل سے انحراف کریں، کیونکہ اس کا تعلق جاری تسلسل سے گہرا نہیں ہوتا اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کا ہنر بھی وقتی فائدے میں شمار ہوتا ہے، جس کیلئے کوئی بھی ہوشمند شخص اپنے جاری تسلسل کو وقتی فائدے کیلئے داو پر نہیں لگا سکتا ہے۔

اس بات کی وضاحت کیلئے زمینی حقائق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا، آپ دوست بھی اس پر باریک بینی سے غور کریں، ماماقدیر جو جدوجہد کررہے ہیں اسکا بنیادی مقصد صرف اور صرف ریاست کے ہاتھوں اغواء شدہ بلوچ نوجوانوں کی بازیابی ہے، ماماقدیر اور اس کی ٹیم پورے عزم، حوصلے اور بہادری سے اپنے کام کولیکر قدم بقدم آگے بڑھتے جارہے ہیں، اول تو تسلسل سے کوئٹہ پریس کلب اور کراچی پریس کلب کے سامنے طویل اور صبر آزما احتجاجی کیمپ نے کچھ نہ کچھ دنیا کی توجہ حاصل کرلی اور اس کے بعد لانگ مارچ جیسے اقدامات نے ماما اور اس کی ٹیم کے پروگرام کو مزید دنیا کے سامنے اجاگر کردیا، ماما کے جدوجہد کا بنیادی مقصد اور طریقہ کار ریاست کو کسی بھی طرح کا جواز مہیا نہیں کرتا جس کو لیکر ریاست ماما کے خلاف کوئی بھی غیر اخلاقی اقدام اٹھائے، ہاں اپنے فیصلوں میں ریاست آزاد ضرور ہے جب، جیسا چاہیے کرسکتا ہے اس وقت تک جو نظر آرہا ہے اس پر بات کی جارہی ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مقام

پر ماما کے لانگ مارچ میڈیا کوریج اور توجہ حاصل کرنے کے نتائج کو دیکھ کر اگر بی این ایم، بی ایس او آزاد یا بی آر پی جیسے پارٹیوں کے کرتا دھرتاؤں کا دل للچائے کہ موقع اچھا ہے کیوں نہ ہم بھی کچھ فائدہ اٹھائیں تو یہ وقتی فائدے کیلئے اپنے تسلسل کو فراموش کرنے جیسا ہوگا، کیونکہ ماضی میں تمام بر سر زمین پارٹیاں سر عام جو جدو جہد کر رہے تھے اس کے خلاف دشمن ریاست نے جو فیصلہ لیا وہ ہمارے سامنے ہے، ہزاروں ایسے کارکنان قتل کر دیئے گئے جنکا زیر زمین مسلح جدو جہد سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا (آج کا تحفظ پاکستان آرڈیننس زیر بحث نہیں جس میں صاف اور واضح قانون بن چکا ہے کہ

وضاحت کرسکیں گے کہ ریاست کے ہاتھوں اغواء شدہ بلوچوں کے بازیابی کیلئے قومی کاز میں وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے پلیٹ فارم سے ماما قدیر اور فرزانہ مجید بہتر اور موثر طریقے سے جو جدو جہد کر رہے ہیں، تسلسل سے جاری ان کی جدو جہد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وائس فار بلوچ مسنگ پرسن ایک ادارہ ہے جو اپنے کام اور جدو جہد کے حوالے سے ایک مقام اور حیثیت حاصل کر چکا ہے، اور دوسری طرف بی ایس او بحیثیت طلبہ تنظیم بلوچ جدو جہد میں اپنے تمام سرگردانیوں کے ساتھ اپنے کام اور فیصلوں کے حوالے سے ایک مقام و حیثیت رکھتا ہے وضاحت طلب بات یہ ہے کہ

ماضی میں سڑکوں پر جدو جہد کرنے والوں کے ہاتھوں میں کوئی بندوق یا بم نہیں تھیں، وہ ہاتھوں میں جھنڈے لیے نعروں سے ایک ہی کام کر رہے تھے جس میں توڑ پھوڑ تک کا عنصر بھی نہیں تھا، لیکن ہاتھوں میں جھنڈے اور نعروں سے وہ جو کر رہے تھے وہ کام اپنے نوعیت کو لیکر آزادی کی جنگ کا دفاع ضرور شمار ہوتا تھا، اس کام کی حقیقت اپنے اندر آزادی کی جو جنگ لڑی جا رہی ہے اسکا دفاع کرنا تھا اور قابض دشمن نے اس دفاعی لائن کے اہمیت کو سمجھ کر اسے ختم کرنے کا فیصلہ لیا اور اسی فیصلے کو لیکر دشمن نے اس دفاعی لائن پر مختلف زاویوں سے وار کرنا شروع کر دیا جس میں نمایاں ان سیاسی کارکناں کا قتل تھا جو شہید غلام محمد کے قتل کے بعد سے لیکر آج تک تسلسل سے جاری ہے۔

ریاست کے خلاف کام کرنے والوں کو کسی بھی طرح کے مدد یا تعاون، تحفظ میں ملوث شخص ہر طرح سے ریاست دشمن تصور ہوگا)

ماضی میں سڑکوں پر جدو جہد کرنے والوں کے ہاتھوں میں کوئی بندوق یا بم نہیں تھیں، وہ ہاتھوں میں جھنڈے لیے نعروں سے ایک ہی کام کر رہے تھے جس میں توڑ پھوڑ تک کا عنصر بھی نہیں تھا، لیکن ہاتھوں میں جھنڈے اور نعروں سے وہ جو کر رہے تھے وہ کام اپنے نوعیت کو لیکر آزادی کی جنگ کا دفاع ضرور شمار ہوتا تھا، اس کام کی حقیقت اپنے اندر آزادی کی جو جنگ لڑی جا رہی ہے اسکا دفاع کرنا تھا اور قابض دشمن نے اس دفاعی لائن کے اہمیت کو سمجھ کر اسے ختم کرنے کا فیصلہ لیا اور اسی فیصلے کو لیکر دشمن نے اس دفاعی لائن پر مختلف زاویوں سے وار کرنا شروع کر دیا جس میں نمایاں ان سیاسی کارکناں کا قتل تھا جو شہید غلام محمد کے قتل کے بعد سے لیکر آج تک تسلسل سے جاری ہے۔

سیاسی کارکنان کے قتل خالصتاً دشمن کے اپنے فیصلے سے تعلق رکھتا ہے، ہاں ایسا ضرور ہے کہ دشمن کے پالیسوں کو بدلتا دیکھ کر بھی ہم نے اپنی روش نہیں بدلی، اتنے نقصانات کے باوجود ہم لکیر کے فقیر ہی رہے جو شاید سنگین غلطیوں میں شمار ہوتی ہو، کہتے ہیں کہ اچھا وہ نہیں ہوتا جو غلطیاں نہیں کرتا غلطیاں سب سے سرزد ہوتی ہیں، غلطیوں کو سمجھ کر جلدی سے انکا سدباب کرنے والا اچھا کہلاتا ہے، غلطیوں کی نوعیت سے قطع نظر غلطیوں کو غلطیاں نہ سمجھنا اور غلطی پر غلطی کرنا سنگین غلطیوں میں شمار ہوتا ہے، ایسا کرنے والوں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے، یہاں ایک اور ضروری نقطے پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں، دن رات اداروں، اداروں کا رٹ لگانے والے کیا اس بات کی

وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے ہوتے ہوئے اس کے کام پر بی ایس او کو لگانا کیا ان دونوں اداروں کے الگ الگ کام کے افادیت و اہمیت سے انحراف نہیں ہوگا؟؟؟

میں بذات خود ہر اس اقدام کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں جو دشمن کے خلاف ہو جو ہمارے دشمن کے لئے پریشانی اور بدنامی کا باعث بنتا ہو بحیثیت ایک بلوچ جہدکار کے لطیف جوہر کے تا دم مرگ بھوک ہڑتال کے فیصلے میں (فیصلے کے صحیح اور غلط ہونے سے قطع نظر) اس کی انفرادی جرات ایثار قربانی کا جزبا اور حوصلہ ہر طرح سے قابل قدر ہے ہاں صرف اور صرف کسی ایک بلوچ نوجوان کی رہائی سے اس کو منسوب کرنا قابل بحث ضرور ہے بالکل اسی مقام پر بحیثیت طلبا تنظیم بی ایس او کے فیصلوں اور لطیف جوہر کے انفرادی جرات اور فیصلے کو ہمارے لئے الگ الگ تجزیے میں لانا انتہائی ضروری ہے تاکہ ہم سیاسی ناپختگی یا سازش یا پھر گروہی برتری کی طفلانہ دوڑ میں سے کسی ایک کو سمجھ سکیں، کیونکہ کوئی بھی ایسا فیصلہ جو اپنے وجود میں ہو تو جائز، لیکن وہ جائز فیصلہ دو الگ الگ اداروں کے کام کو متاثر کرتا ہو اور دونوں اداروں پر منفی اثرات مرتب کرتا ہو، وہ کیسے اداروں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا سبب بنے گا۔ ایسے فیصلے اگر وقتی طور پر اچھے نتائج دیں تب بھی وہ اداروں کے غیر مستحکم اور کمزور کرنے کی وجہ بنتے ہیں تھوڑی دیر کیلئے فرض کریں کہ جو کردار بحیثیت طلبہ تنظیم بی ایس او بلوچ قومی تحریک میں ادا کر رہی ہے اسی کام کیلئے ماما قدیر اور فرزانہ مجید، VBMP کی پلیٹ فارم سے کوشش شروع کریں تو کیسا ہوگا ان کے کام کے نتائج کچھ بھی ہوں ان سے قطع نظر لیکن بحیثیت ادارہ وائس فار بلوچ مسنگ پرسن اور بی ایس او میں ایک واضح تضاد جنم لے گا، خصوصاً بلوچ

قومی تحریک کے تناظر میں اگر اس کو دیکھا جائے تو کیا اسطرح اداروں کو آپس میں متصادم کر کے اداروں کے چیمپئین بننے کا دعوی لفاظی کے زمرے میں نہیں آتا ہے؟ اور کیا ایسے لوگوں کے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے صلاحیت پر سوالات نہیں اُٹھتے ہیں؟ یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے انکو پرکھنے کا زاویہ نظر ہی غلط اور حقائق کے منافی ثابت ہو رہا ہے ایسی صورتحال میں آپ سدھار کیسے پیدا کر سکیں گے میرے کہنے اور لکھنے کو اصل میں ایسے ہی زاویہ نظر رکھنے والے انتشار سے تشبیہ دیتے آرہے ہیں یہ بھی پرکھنے کی ضرورت ہے کہ بگاڑ اور انتشار کی وجہ وہ کون سے اقدامات بن رہے ہیں ایک ہی مقصد ہونے کے باوجود دوری اور تصادم کی سی صورتحال کی حقیقی وجوہات کیا ہیں؟ میرے ناقص رائے کے مطابق وہ تمام متضاد فیصلے جو ہمارے تحریک کے حقیقی تسلسل سے میل ہی نہیں کھاتے یا بعض مقامات پر اس تسلسل سے متصادم نظر آتے ہیں وہی اصل وجوہات ہیں انتشار یا بگاڑ کے لئے ایسا بالکل نہیں کہ حقیقی وجوہات کی نشاندہی یا ان پر سوال اُٹھانا یا ان کو عوامی سطح پر زیر بحث لانا انتشار و بگاڑ کی وجہ بنتے ہیں، ہاں ایسا ضرور ہے کہ مقدس اداروں کی رٹ اور رہم جانے ہمارا کام جانے والی لفاظی میں شاید یہ سب کچھ توہین کی زمرے میں آتے ہوں، ایسی صورت حال میں شاید کسی پے یہ گراں گزرے اور اس کو مداخلت کی سی صورتحال لگے اگر آپ اس تمام صورتحال کو مدنظر رکھ کر تجزیہ کریں گے تو یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا آج آزادی کے دعوے دار قوتیں تحریک کے تسلسل اور وقتی فوائد میں بہتر طور تمیز کر رہے ہیں؟ اب آتے ہیں موضوع کی طرف برسرزمین جدوجہد کرنے والی تمام قوتوں نے شروع دن سے ہی قومی آزادی کیلئے لڑی جانے والی جنگ کے دفاع کو ہی اپنے جدوجہد کا محور بنایا، جو قومی جدوجہد کے دعووں کے عین مطابق ہے، ورنہ تو بی این پی مینگل اور نیشنل پارٹی بھی اپنے آپ کو قوم پرست کہتے نہیں تھکتے، ہاں کارکردگی، پرچار شروع کر رکھا ہے، میرے ناقص رائے کے مطابق تمام مسلح تنظیمیں جو اس وقت مسلح طریقہ کار کے تحت قومی کاز میں کردار ادا کر رہے ہیں، ان سب کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ ہم نے بحالت مجبوری بندوق اٹھایا ہے ہمیں اپنے سیاسی جدوجہد کے حق سے بزور بندوق روکا جا رہا ہے، اس لئے ہم نے بھی بحالت مجبوری بندوق اٹھایا ہے تو اس فلسفے میں یہ بات واضح ہے کہ دشمن نے اس راستے کو بند کردیا ہے جسے لوگ پرامن اور جمہوری جدوجہد کہتے ہیں کیونکہ جہاں کہی بھی سیاسی مسائل کے حل کو سیاسی طریقے سے حل ہونے سے روکا جاتا ہے اور بزور قوت سیاسی طریقہ کار کے دروازے بند کیے جاتے ہیں وہاں مسلح طریقہ کار کو اسلئے اپنایا جاتا ہے تاکہ جو لوگ سیاسی عمل کے زریعے سیاسی مسائل کے حل سے انکاری ہیں ان کو طاقت کے زریعے سیاسی عمل پر آمادہ کیا جائے تاریخی حوالے سے دنیا کے تحریکات میں اکثر و بیشتر ان دونوں یعنی مسلح اور غیر مسلح طریقہ کار کو بروکار لایا گیا ہے اور بہت سے تحریکات میں صرف اور صرف مسلح طریقہ کار ہی استعمال کیا گیا ہے اور کہیں پر گاندھی جی جیسی تاریخ بھی پڑھائی گئی ہے اصل میں ان دونوں طریقہ کار یا ان میں سے کسی ایک کے لئے فیصلہ اپنے اپنے معروضی حالات اور زمینی حقائق کو لے کر ان کی حقیقت پر مبنی تجزیوں کی صداقت پر کی جاتی ہے اگر ہم اپنے حالات پر نظر دوڑائیں تو مسلح جدوجہد شروع ہونے سے بہت پہلے پسنی میں پانی کی مانگ کرنے والے احتجاجی عورتوں بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلانا، سوراب میں ڈی سی کے تبادلے کا مطالبہ کرنے والے لوگوں پر گولیاں چلانا، ہزار گنجی میں بجلی کی مانگ کرنے والے زمینداروں پر گولیاں چلانا اس ریاست میں بلوچوں کیلئے پرامن اور جمہوری جدوجہد کرنے کی گنجائش کا پتہ دیتے ہیں، اور تو اور تمپ کے سکول میں پرامن جلسہ کرنے والوں پر گولیاں چلانے والے واقعہ کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا، جلسہ جلوس کی اہمیت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، ہمارے لئے یہاں اس فرق

دوران انقلاب مجموعی صورتحال کے اثرات سے متاثر ہو کر جب عوام شعوری فیصلے کے تحت گھروں سے نکل کر دشمن کے منصوبوں کے سامنے رکاوٹ بنتے ہیں تب نہ کوئی لاٹھی اور نہ گولی عوام کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکتی ہے تو ایسی صورتحال میں بھی انقلابی پارٹیوں اور تنظیموں پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ عوام کے جذبات کو صحیح سمت دے کر کامیابی سے ہمکنار کریں، ایسا کرنے کیلئے انقلابی تنظیموں کے پاس ایک جامع پروگرام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایسی طاقت اور وہ اعتماد بھی ہونا چاہیے جو ان کے اور عوام کے بیچ پل کا کردار ادا کر سکے

حکمت عملی، طریقہ کار پر جتنی بھی زیادہ تنقیدی بحث کی جائے کم ہے، میرے حواس کے گرفت میں ایک سوال بہت ہی زیادہ گردش کر رہا ہے، جو میں دوستوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، کچھ دنوں سے آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ کا نعرہ لگانے والے کچھ لوگوں نے بغیر کسی مضبوط اور مطمئن کن جواز کے پرامن اور جمہوری جدوجہد کا کو سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ دوران انقلاب مجموعی صورتحال کے اثرات سے متاثر ہو کر جب عوام شعوری فیصلے کے تحت گھروں سے نکل کر دشمن کے منصوبوں کے سامنے رکاوٹ بنتے ہیں تب نہ کوئی لاٹھی اور نہ گولی عوام کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکتی ہے تو ایسی صورتحال میں بھی انقلابی پارٹیوں اور تنظیموں پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ

عوام کے جذبات کو صحیح سمت دے کر کامیابی سے ہمکنار کریں ،ایسا کرنے کیلئے انقلابی تنظیموں کے پاس ایک جامع پروگرام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایسی طاقت اور وہ اعتماد بھی ہونا چاہیے جو ان کے اور عوام کے بیچ پل کا کردار ادا کر سکے، (نواب اکبر خان کے قتل کے وقت ان کے شہادت کو لے کر عوامی جزباتی ردعمل کے موقع پر عوام اور پارٹیوں کے بیچ اس کا فقدان واضح طور پر نظر آیا جو قابل غور ہے) بصورت دیگر پارلیمانی پارٹیوں کی طرز پر دور دراز علاقوں سے تعلقات کی بنیاد پر لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح گاڑیوں میں بھر کر لانا اور کئی مقامات پر لوگوں کو بلوچیت کا واسطہ اور بلوچی غیرت کا شغان دے کر جلسے جلوسوں میں شرکت کرانا ایک ایسا مجمع اور تماشہ ہو سکتا ہے جسے کسی کو دکھایا جا سکے لیکن اس پر بغلیں بجا کر کامیابی کی نوید سنانا بے بنیاد لفاظی اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے سوا کیا ہو سکتا ہے، ہمارے یہاں یہ اکثر اوقات ثابت ہو چکا ہے جس کیلئے آپ غور کریں کہ کسی بھی ریلی یا جلسے پر لاٹھی چارج آنسو گیس یا گولیاں چلی ہیں،تو وہاں عوام سے پہلے لیڈر صاحبان ایسے غائب ہوئیں کہ جیسے کہ گدھے کے سر سے سینگ،اور پھر مہینوں کیا سالوں تک وہاں کسی نے اجتماع کرنے کا سوچا تک نہیں ہے، (2008 خضدار میں یوم فدا کے حوالے سے بی این ایف کا جلسہ اور اس میں ایف سی کے مداخلت کے بعد کی صورتحال زیر بحث نہیں اور یہ وری روڈ پر خواتین پینل کے احتجاج پر پولیس کی لاٹھی چارج اور اس کے بعد آج تک خواتین پینل کا منظر عام سے غائب ہونا بھی زیر بحث نہیں) کسی بھی اجتماع میں عوامی شرکت اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا جتنا کہ اس اجتماع میں شریک عوام کی اپنے مقصد سے شعوری لگاؤ اور ان کے حقیقی جذبات اور قربانی دینے کا جذبہ ہوتا ہے، کیونکہ جب لوگوں پر گولیاں چلائی جاتی ہیں،لوگ مرتے ہیں مگر وہ پیچھے نہیں ہٹتے ،مر جاتے ہیں، مگر اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنا نہیں جانتے ،لوگوں کو اس حد تک تیار کرنے کیلئے بھی ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں جو لوگوں کے فیصلہ کرنے کی قوت پر اثر انداز ہوتے ہیں، ہمارے ہاں تو ایسے حالات کی پہچان بھی سوالیہ نشان بن چکا ہے، فی الحال تو ہم آزادی کا ایک ڈھنگ گوریلا جنگ اور پرامن اور جمہوری جدوجہد کے بیچ سرگردان نظر آتے ہیں،اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے درد کا درمان کیا ہے، مجھے یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ پچھلے بارہ سالوں سے ہم نے جس نعرے" آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ" کو لیکر زمین و آسمان ایک کر دی،

آج ہم اسی نعرے آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ سے کان پکڑ کر دانتوں تلے زبان دبا کر توبہ کی سی حالت میں نظر آتے ہیں کئی ایسا نہ ہو کہ چھ ماہ یا ایک سال بعد یا پھر کسی پاکستانی حکومت کی تبدیلی کے بعد پرامن اور جمہوری جدوجہد کے لفاظی سے اسی طرح کان پکڑ کر تائب ہو جائیں اور اس دوران جتنے بھی گئے اپنے جان سے گئے ہمارا کیا۔۔!

میں یہاں اس حقیقت کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھوں گا کہ مشرف دور حکومت میں بلوچوں کے خلاف بننے والی پالیسوں میں اور اس کے بعد پیپلز پارٹی کے دور حکومت کو لیکر آج مسلم لیگ نواز شریف کی حکومتی پالیسوں کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے ان میں تھوڑی سی رد و بدل اور معمولی بدلاؤ بھی صاف طور پر دشمن کے اپنے اندرونی معمولات ،مسائل اور مجبوریوں سے تعلق رکھتا ہے،اس میں کئی بھی بلوچوں کو لیکر ان کیلئے بہتری کا

آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ کا نعرہ لگانے والے کچھ لوگوں نے بغیر کسی مضبوط اور مطمئن کن جواز کے پرامن اور جمہوری جدوجہد کا پرچار شروع کر رکھا ہے،میرے ناقص رائے کے مطابق تمام مسلح تنظیمیں جو اس وقت مسلح طریقہ کار کے تحت قومی کاز میں کردار ادا کر رہے ہیں،ان سب کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ ہم نے بحالت مجبوری بندوق اٹھایا ہے ،ہمیں اپنے سیاسی جدوجہد کے حق سے بزور بندوق روکا جا رہا ہے،اس لئے ہم نے بھی بحالت مجبوری بندوق اٹھایا ہے تو اس فلسفے میں یہ بات واضح ہے کہ دشمن نے اس راستے کو بند کر دیا ہے جسے لوگ پرامن اور جمہوری جدوجہد کہتے ہیں

ذرا برابر عمل دخل نہیں،

اگر کسی بھی وجہ سے ہم اتنی معمولی بدلاؤ کے دھوکے میں آئیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی جنگ کی حقیقی تسلسل کو فراموش کر چکے ہیں یا پھر کسی بھی وجہ سے فراموش کرنا چاہتے ہیں،تو یہاں یہ سمجھنا بالکل مشکل نہیں رہا کہ قابض دشمن ریاست میں جمہوریت کے نام پہ کیا کچھ ہوتا آ رہا ہے، یہاں جمہوریت کو ایسا کھیل بنایا گیا ہے جس کے تمام حدود و قیود قابض ریاست کے اختیار داری طے کرتے ہیں، انکا اپنے خصوصاً پیپلز پارٹی او مسلم لیگ نواز جیسی جماعتیں بھی جب ان کے حدود وقیود کبھی کبھار پھلانگتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی یہ دشمن کی طرح سلوک کرتے ہیں، لیاقت علی خان کا قتل، پیپلز پارٹی، بھٹو خاندان کا انجام، نواز شریف و مشرف قابض ریاست کی تاریخ کے انمٹ حصہ بن چکے ہیں، زرداری کی فوج سے کشمکش اور آج نواز شریف اور فوج کے بیچ ہونے والی کشمکش واضح ہے اب جہاں زمینی حقائق یہ ہوں تو دوسری طرف قابض دشمن سے چھٹکارہ حاصل کرنے والا کوئی جمہوری جدوجہد اور پرامن رہنے کیلئے ہر دن صحافیوں کے سامنے گلہ پھاڑے تو حیرت کے ساتھ ساتھ سوال پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے ۔

اب اگر ہم ماضی قریب کے مختصر تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں پرامن جدوجہد کرنے والوں میں صاف طور پر پارلیمنٹ پرست نام نہاد قوم پرست اختر مینگل کے لانگ مارچ (لشکر بلوچستان) کا انجام ،شہید غلام محمد کی جدوجہد کو لیکر ان کا انجام اور تازہ ترین

آزادی کے مطالبے کی نسبت چھوٹے پیمانے پر صرف اور صرف اغواء شدہ بلوچوں کی بازیابی کولیکر ماماقدیر کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے باوجود ایک نوجوان کا بازیاب نہ ہونا ہمارے سامنے ہے، اب سمجھ میں نہ آنی والی بات یہ رہ جاتی ہے کہ بی ایس او جیسی طلبہ تنظیم جو خود شروع سے قومی آزادی کے جنگ کا دفاعی لائن ظاہر کرتی آرہی ہے ہزاروں لیڈر اور کارکن قربان کرنے کے باوجود آج کیوں اور کیسے جمہوری اور پر امن جدوجہد کی ضمانت دینے کیلئے اخبارات میں پوری دنیا کو گواہ بنانا چاہتی ہے، شاید اس امر کی وضاحت کرنا

تمام آزادی پسند پارٹیوں پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو یہ باور کرانے میں دن رات ایک کریں کہ قابض دشمن مسلح اور غیر مسلح جدوجہد کرنے والوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا ہے اور اکثر مقامات پر عام عوام بھی یکساں طور پر نشانہ بن رہے ہیں اب ایسے حالات میں ٹیسٹ کے لئے صرف اور صرف BSO کو گراونڈ میں اُتارنا بہت سے شکوک وشبہات کی وجہ بن رہی ہے۔ دنیا کے تحریکات پر اگر نظر ڈالی جائے تو حقیقی شعور اور کھوکلی آزادی کے حوالے سے بہت سے سوالات اٹھیں ہیں۔ حقیقی شعور کے تناظر میں دیکھیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قومی تحریک میں موجود ایسی قوتیں جو اپنے حقیقی دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرسکیں جو وقت و حالات کو حقائق کے تناظر میں سمجھ نہیں سکتے۔ وقتی فوائد اور تحریک کے تسلسل میں تمیز نہیں کرسکتے جو طویل المدت اور قلیل المدت مفاوات کے فرق سے بے نیاز ہوتے ہیں جو اپنے مقصد کے حقیقت پر پر وقتی مسائل کو ترجیح دیتے ہیں ایسے قوتوں کا شعور حقیقی شعور نہیں کہلاتا انکے کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اتفاقات کے نتائج بھی کھوکلی آزادی سے تعلق رکھتے ہیں یعنی کہیں پر اتفاقات کام کر بھی جائیں تب بھی وہ حقیقی آزادی نہیں ہوگی وہ کھوکلی آزادی کہلائے گی ان تمام باتوں کے خلاصہ کرنے کا مقصد صرف اور صرف ان انحرافات سے ہیں جو قومی تحریک کے تسلسل سے کیے جارہے ہیں میں صرف اور صرف غور کرنے کا کہوں گا کیونکہ قومی تحریک کے تسلسل میں حقیقی بنیاد پر کیے گئے وہ اقدامات جن کے ذریعے اصلاحات اور تبدیلی کے ذریعے تشکیل نو کے لئے موثر جدوجہد کے امکانات روشن ہوتے نظر آسکتے تھے یعنی BNF کی مضبوطی ،13 نومبر، چارٹر اور اداروں کا آزادانہ استحکام اور ساتھ ہی ساتھ حقیقی سمت میں سفر کرنا وغیرہ۔ ان سے متواتر روگردانی کی گئی شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ اختلاف رائے کو لے کر سیاسی ناپختگی یا بلوچی ضد یا علاقائی اور گروہی سیاست سے اس کے تانے بانے ملتے ہوں لیکن آج کل جو کچھ ہورہا ہے اس میں ایک اور پہلو کے امکانات نمایاں ہوتے جارہے ہیں ریاست کی طرف سے تحریک کے خلاف کام میں لائے جانے والے گماشتوں جام، جمالی، ریئسانی اور مالک جیسوں سے کام لینے والی پالیسی اور ساتھ ہی ساتھ شفیق اور سراج جیسے کرائے کے قاتلوں کو بھی کام میں لانے سے زرا آگے بڑھ کر تحریک کے اندر نئے انداز میں کام شروع ہونے کے اندیشے پختہ ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے سازشوں کے امکانات کو کسی صورت بھی رد نہیں کیا جاسکتا لہذا ایسے سازشوں کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اتفاقات تسلسل نہیں رکھتے لیکن یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چھوٹے بڑے تمام اختلافات اپنے منطقی نتائج کو لے کر بلاآخر تحریک کو مستحکم کرنے کا سبب بنتے ہیں ناکہ اپنے انجام سے پہلے ہی تحریک کے تسلسل کے خلاف سر اٹھاتے ہیں یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ باریک بینی سے قومی تحریک کے ابتداء کو لے کر اس کے حقیقی تسلسل کے تناظر میں غیر جانبدارانہ غور و تحقیق کا متقاضی ہے۔

ریاست کی طرف سے تحریک کے خلاف کام میں لائے جانے والے گماشتوں جام، جمالی، ریئسانی اور مالک جیسوں سے کام لینے والی پالیسی اور ساتھ ہی ساتھ شفیق اور سراج جیسے کرائے کے قاتلوں کو بھی کام میں لانے سے زرا آگے بڑھ کر تحریک کے اندر نئے انداز میں کام شروع ہونے کے اندیشے پختہ ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے سازشوں کے امکانات کو کسی صورت بھی رد نہیں کیا جاسکتا لہذا ایسے سازشوں کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اتفاقات تسلسل نہیں رکھتے لیکن یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے نظر آتے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆

آج جس تقسیم در تقسیم اور ناکامی کا جو دور دورہ ہے، اس پر بھی متعدد بار ہم تحریری اظہار خیال کر چکے۔ اور بین الاقوامی انقلابی تحریکوں کی تقسیم در تقسیم اور ناکامی کے حوالے یہاں تک لکھ چکے تھے۔ وہ یہ کہ آگے چل کر یہ گروپ آپس میں ٹکرایں گے اور (توبہ نعوذ باللہ) اگر اللہ تعالیٰ بھی درمیان میں آجائے تو اس باہمی کشیدگی اور ٹکرائے جانے کو روک نہیں سکیں گے

بلوچ دانشور، صورت خان مری

انٹرویو۔میر مبارک علی

ہمگام۔ بلوچ سیاست سے آپکی وابستگی زمانہ طالب علمی سے رھی ھے۔ اس بارے میں آپ کچھ بتانا چاہیں گے؟

صورت خان مری۔ بلوچ طلبا تنظیم کی ابتدا بالخصوص اس وقت کے سیاسی مدوجزر، اتار چڑھاؤ کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لئے بلوچ سیاسی پس منظر کا ادراک لازم ہے۔ بلوچ ایک قوم ہے، اسکی سات لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ کی گل زمین اور اپنی الگ مخصوص جغرافیائی حیثیت کی سرزمین ہے۔ تہذیبی لحاظ سے نہ اس کا براہ راست ہڑپہ تہذیب سے تعلق ہے اور نہ ہی موسیپوٹیمیا ایرانی تہذیب سے متعلق ہے، سماجی طور پر ایک غلط فہمی اور پروپیگنڈہ کا ازالہ لازم ہے وہ یہ کہ بلوچ کو قبیلہ اور قبائلیت کا شکار بتایا جاتا ہے اہمیت کا حامل یہ ہے کہ جو لوگ بلوچ کو قبیلہ اور قبائلیت کی گالی دینا پسند کرتے ہیں ان کے محدود ذاتی اور گروہی مفادات ہیں وہ انگریز اور پاکستانی سامراج کے پروپیگنڈہ تلے بہتے تیرتے چلے جارہے ہیں۔ یا پھر وہ "قبیلہ" "TRIBE" کے صحیح سماجی معنوں سے نابلد ہیں۔ قطع نظر انتھراپالوجی کا علم، اگر ڈکشنری میں بھی TRIBE کے معنی دیکھی جائے تو شرم کے مارے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں انتھراپالوجی اور سماجیات کی رو سے انسانی نسلی ارتقاء دو طرح کی ہے اول نسلی یا ہوموجینین سوسائٹی، جو ایک مخصوص شخص، اسکی اولاد، خاندان بکر CLAN قبیلہ اور قبائلیت کے تعصبات کا مارا قوم، اس سماج کی تحقیق کے لئے ایک فیملی ٹری "FAMILY TREE" بنایا جانا کافی ہے، اس طرح کے قوم میں نہ غیر شامل ہوسکتا ہے اور نہ ہی نکلی یا نکالا جا سکتا ہے، اس قوم کی قومی خصلت یا نیشنلزم کو لسانی ETHNIC نیشنلزم کہتے ہیں، خصوصیت میں بادشاہت MONARCHY، جبر، تعصب، محنت وغیرہ گنوائے گئے، چنانچہ ان قباحتوں سے چھٹکارا پانے لے لئے برطانوی انگریز نے سولہویں صدی کے آخر ہی میں تحریک چلائی اور ہیٹروجینین سوسائٹی کی خصوصیات و نیشنلزم جو کہ CIVIC نیشنلزم ہے، اپنانے کے لئے کوشش شروع کیں، ان اقوام یعنی سیاسی یا استعماری یا ہیٹروجینین کی خصوصیات دیگر کے علاوہ سوسائٹی کی وفاقیت (یاد رہے، وفاقیت سوسائٹی کی خاصیت ہے، ریاستی بنیاد کا جواز نہیں ہوسکتا) خود اختیاری یا اٹانومی، ہیرارکی، برابری، مشاورت (رائے عامہ کی بالادستی یا جمہوری لائحہ عمل) وغیرہ، یہ قوم اور سوسائٹی کئی نسلوں کے اشتراک، مذہبی تعصب سے آزاد کسی بھی مذہب کا فرد قوم کا برابر کا حقدار ہوتا ہے، کسی بھی زبان نے تعلق رکھتا ہو، کسی علاقہ سے ہو، وہی عمومی اعلان کے ساتھ قوم کا فرد بن سکتا ہے، اس سیاسی اتحاد پر قوم کی وحدیت، اسکی نیشنلزم اور حب الوطنی ہے۔ بلوچ ہیٹروجنئیں سوسائٹی کی قوم ہے، اس کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے قومی وحدت اور اپنی سرزمین کی حفاظت کے لئے اس نے بے شمار جنگیں لڑیں، صرف برطانوی سامراج کے خلاف چار سو سے زائد جنگیں بلوچوں نے لڑیں تھیں، پاکستان نے مارچ 1948 کو بلوچستان پر فوجی قبضہ کیا، اور آج 2014 تک بلوچ اپنی قومی آزادی کے لئے پاکستان، ایران کے خلاف برسرپیکار ہے سیاسی طور پر جب 1948 کے دوران پاکستان کی طرف سے الحاق کے حوالے سے شدید دباؤ ڈالا گیا تو بلوچ ریاست، ریاست قلات کے دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر الحاق کی تجویز کو رد کیا۔ خود قائد پاکستان محمد علی جناح اور عالمی شہرت کے دیگر وکلاء نے جون 1946 کے برطانوی کابینہ مشن کو قائل کیا تھا۔ وہ یہ کہ بلوچستان ایک آزاد خود مختیار مملکت ہے، اس کے برطانوی مملکت کے ساتھ "معاہدات" ہیں۔ اب برطانیہ چھوڑ چھاڑ کر واپس ہورہے تھے، تو وہ تمام معاہدات منسوخ ہوجاتے ہیں اور ما قبل معاہدات یعنی 1840 کا بلوچ ریاست یعنی دریائے سندھ کے بام، کرمان، بحیرہ بلوچ (عرب) سے دریائے ہلمند تک بشمول بلوچ کاریڈور جوز کمانستان بلوچ آبادی تک پھیلا، بلوچ آزاد خود مختیار ریاست بلوچستان تھی، برٹیش بلوچستان، جس میں

معاہدات کے تحت پشتون علاقے افغانستان سے الگ کر کے شامل کئے گئے۔۔چنانچہ جب برٹیش بلوچستان کا بلوچ ریاست سے الگ کوئی حیثیت نہیں، سندھ سمیت بلوچ آبادی علاقوں کی حیثیت کی بابت پوچھا گیا تو بلوچ نمائندوں نے کھل کر ریاست قلات کے بلوچوں کے ساتھ اپنی رائے کے حق کے ادراک کا اعلان کیا تھا۔

یہاں ہم قلات نیشنل پارٹی اور بعد ازیں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے بلوچ رہنماؤں کے سوداباز یوں اور اعتراف کی تفصیلی کا درازی داستان کے بنا گریز کرتے ہوئے فقط بلوچستان سٹیشین یونین کے قیام میں ان رہنماؤں کی تابع حکم شرکت اقتدار کی لالچ کا اشارہ کرتے ہوئے، ون یونٹ کے قیام اور جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران پاکستان میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے بناء "زیرزمین" سیاسی تگ وددو کا مختصر ذکر کریں گئے، جو بلوچ طلباء تنظیم "ورنا واندہ گل" (بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) کا سبب بھی بنا تھا۔ اور یہی سیاسی تگ ودوہی نے آگے چل کر بلوچ طلباء اور جھلاوان کے بغاوتوں کے بنیادی مقاصد میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، البتہ نواب نوروز خان، خان قلات کی سرکردگی میں خانیت کی ریاست قلات کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ البتہ 1960 کی بلوچ انسرجنسی جمہوری بلوچ قومی آزادی کے لئے تھا، جس کو سرکار پاکستان سرداریوں کی بحالی کے لئے جنگ سے تشبیہ دینا چاہ رہا تھا، اسی دوران 1962 کو بلوچ قائدین کوئٹہ میں موجود تھے، اور کوئٹہ کے سیاسی کارکنوں نے انہیں استقبالیہ دیا تھا جس میں ہم بلوچ کچھ طلباء بھی شامل تھے۔ چنانچہ اس میل ملاقات میں بلوچ طلباء کو منظم کرنے کی تجویز دی گئی تھی، جو بلوچ نیشنلسٹ تحریک کا ہی بازو رہیگا، چنانچہ جون 1962 کو بلوچ طلباء کے ایک اجلاس میں کوئٹہ میں بلوچ طلباء تنظیم "ورنا واندہ گل" بلوچ نام اور "بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن" کا اعلان کیا گیا جس کی صدارت کے لئے عبدالکریم بلوچ کو چنا گیا۔ بعد میں حالات وواقعات کے تناظر میں وہ یہ کہ تحریک کے تسلسل کے حوالے سے ایک "ہائی کمان" بھی ترتیب دی

قوم اور سوسائٹی کی نسلوں کے اشتراک، مذہبی تعصب سے آزاد کسی بھی مذہب کا فرد قوم کا برابر کا حقدار ہوتا ہے، کسی بھی زبان نے تعلق رکھتا ہو، کسی علاقہ سے ہو، وہی عمومی اعلان کے ساتھ قوم کا فرد بن سکتا ہے، اس سیاسی اتحاد پر قوم کی وحدیت، اسکی نیشنلزم اور حب الوطنی ہے

تنظیم کو دھڑے بندی کا شکار کیا تھا، بلوچ نیشنلزم کے تحت طلباء کا قومی شعور پاکستان یا پاکستانی سامراجی مظالم سے قبل، برطانوی سامراج میں بھی یکساں موجود تھا۔ ہمارے پاس 1931 کی ایک اصل ORIGINAL بلوچ اسٹوڈنٹس ایسوسیشن سنڈیمن ہائی سکول گروپ فوٹوگراف موجود ہے، جس میں اس وقت کے تیس بلوچ طلباء شامل ہیں، اب ان میں سے کوئی شخصیت بقیہ حیات نہیں، آخری شخصیت میر نصیر احمد زئی گزشتہ دنوں وفات پا گئے، دیگر میر گل خان، میر لعل بخش مینگل، میر عبدالواحد، میر محمد بخش لہڑی، میر فاضل خان محمد شہی، میر صالح محمد مری وغیرہ تھے، اس کے بعد 1950 کی دہائی کے وسط میں امان گچکی وغیرہ نے "ورنا واندہ گل" کے نام سے تنظیم بنائی، اس کے چند اجلاس بھی ہوئے، بعد ازاں بستی کے ایک آدھ "پڑین" نیم پشتون نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا، وہ یہ کہ بلوچ تنظیم میں انکی شمولیت اغیارت ہے، چنانچہ تنظیم آگے نہ بڑھ سکی، جیسے کہ اوپر ذکر آیا، جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے ابتدائی سالوں کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں بہت سختی برتی گئی، بلوچ سیاسی قائدین نے "کراچی منگوپیر" کے سردار عطاللہ کے رہائش گاہ پر ایک میٹنگ کی تھی، جس میں زیر زمین بلوچ نیشنلزم کی بنیاد پر سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ بعد میں ان سرگرمیوں کو وسعت دی گئی، یاد رہے، جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے خلاف نواب نوروز خان کی سرکردگی میں بغاوت اور 1960 کی دہائی کے دوران مری بگٹی گئی تھی، جس کا چیئرمین راقم الحروف تھے۔ طلباء تنظیم کا ایک ادبی سرکل "لبزانکی دیوان" بھی منظم کیا گیا، جس کے ہفتہ وار ادبی اجلاس ہوتے تھے، کوئی مہمان اجلاس کی صدارت کرتا تھا، تنظیم کا جنرل سیکریٹری راقم الحروف اور جوائنٹ سیکریٹری کریم دشتی مرحوم تھے۔ کچھ عرصہ بعد غالباً ستمبر 1962 کو کراچی کے بلوچ طلباء نے بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشن آرگنائزیشن کی تنظیم کاری کی، کوئٹہ اور کراچی دونوں تنظیموں نے اعلانیہ کسی پاکستانی پارلیمانی پارٹی کا بازو بننے سے انکار کیا، جہاں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کو غلط فہمی تھی، پارٹی بلوچ طلبا کو اپنی پارلیمانی مقاصد کی تکمیل میں استعمال کریگی، طلباء تنظیموں نے جنرل باڈی کابینہ اور ہائی کمان کی عمومی اتفاق سے اعلان کیا تھا، کہ وہ صرف اور صرف بلوچ قومی کاز سے وفادار رہیں، اسی کے لئے کام کرتے رہیں گے، یہاں اس زمانے کے یعنی 1960 کی دہائی کے وسط میں تین اہم سیاسی پیش رفتوں کا ذکر کریں گے، جو آگے چل کر نہ صرف قلات نیشنل پارٹی کے 1948، بلوچ قومی آزادی کے اپنے قول قرار سے منحرف ہونے اور خاص کر کراچی منگوپیر دوبارہ بلوچ مٹی کی قسم کو توڑ کر ایک اور انحراف کا شکار ہو کر پوری طرح آشکارہ EXPOSE ہوا، اور مفادات اور تابع حکم شرکت اقتدار کے لئے سودابازیوں میں لگ گئے، اہمیت کی حامل پہلی سیاسی پیش رفت جو بلوچ سیاست اور طلباء تقسیم اور نظریاتی اختلاف کا سبب بنی، وہ سرکار اور پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے مابین

مذاکرات کا ایجنڈا تھا، جیسے کہ بیان کیا گیا 1960 کی دہائی کے اوراوائل بلوچ انسرجنسی جونہی تھکاوٹ کا شکار ہوئی سرکار پاکستان نے انسرجنسی کے مقاصد سرداریوں کی بحالی قرار دیا یاد رہے ایوبی مارشل لاء نے ناراض ہوکر نواب مری، نواب بگٹی اور سردار مینگل کی سرداریاں سرکاری سطح پر ختم کردی تھیں، مذاکرات کا ایجنڈا سرداریوں کی بحالی اور بلوچستان میں امن وامان کی ذمہ داری قرار دے کر، اپنی تین سرداروں کے ساتھ مذاکرات کا ایجنڈا طے پانے لگا، بلوچ سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور طلباء کے ایک گروپ نے موقف اختیار کیا۔ انسرجنسی بلوچ نیشنلزم اور قومی آزادی کے لئے تھا، سرکار کے ساتھ مذاکرات اگر کرنے ہی ہیں، تو "وقفہ" کی اہمیت تلے بجا، البتہ جو بھی ایجنڈا ہو، مذاکرات سیاسی بنیادوں پر ہوں اور مذاکراتی ٹیم میں سیاسی نمائندگی لازم ہے، بیشک میر غوث بخش بیزنجو ہی کو شامل کیا جائے۔ بات بگڑتی چلی گئی، انجام کار خضدار ایک جلسہ میں سرداروں کی موجودگی میں گورنر مغربی پاکستان نے سرداروں کی بحالی کا سرکاری اعلان کیا۔ یوں بلوچ سیاست اور بلوچ طلباء تقسیم کا شکار ہوئے، دوسری پیشرفت، ایوبی مارشل لا کی سیاسی سرگرمیوں میں نرمی کے باعث پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی بلوچ قیادت کا پارلیمانی سیاست مراجعت کا تھا، اب ترجیح پارلیمانی سیاست ووٹ، الیکشن اور تابع حکم شرکت اقتدار اور مفادات کو حاصل ہونے لگا، یوں محسوس ہوتا تھا ماضی قریب جب سیاسی کھلے عام سرگرمیوں پر پابندی تھی تو پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کا بلوچ قیادت کی بلوچ نیشنلزم وابستگی نمائشی اور سیاسی تسلسل اور عوامی رابطوں کے بابت ہی تھی آگے چل کر پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے بھرپور الیکشن لڑے، ماضی کے بلوچ نیشنلزم کی شہادتوں اور قربانیوں کو کیش کیا گیا، مشرقی پاکستان، بنگالیوں کی نسل کشی پر آنکھیں موندھی گئیں، بھٹو کے ساتھ سیاسی سودابازی کی گئی، تابع حکم شرکت اقتدار کی خاطر بلوچ وسائل آئینی طور پر پنجاب کے حوالے کئے گئے، آئین سادہ پارلیمان میں متفقہ منظور ہوا، البتہ خود فریبی کے طور پر آئین پر بلوچ اکثریتی نمائندوں نے دستخط کرنے سے انکار کیا تھا۔

تیسرا اہم واقعہ جو بلوچ نیشنلزم تحریک کے دل پر آخری مہلک چھرا گھونپنے کا سبب بنا تھا، وہ پاکستان نیشنل پارٹی کے ایک باقاعدہ اجلاس میں بلوچ قیادت کی تجویز کی منظوری وہ یہ کہ، پارٹی بلوچ طلباء میں سیاسی کام کریگی، یہ واقعہ ایک چشم دید سیاسی کارکن اور سینئر صحافی جناب اکبرا چکزئی نے بتائی اور مجھے یاد پڑتا ہے، اس موقع پر ڈاکٹر مالک اور بلوچی رسالہ کے مدیر واحد بندگ بھی موجود تھے چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی کی بلوچ

> آج اکیسویں صدی کا" کھلاپن، گلاسنوسٹ"اور نجانے کیا کچھ دعوے لئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مالک اور نیشنل پارٹی کی سرکار ہے۔ کتاب خانوں پر چھاپے کے دوران انگریز سرکار کے عہد کے 1902 کے لالہ ہتھورام کی تاریخ بلوچستان ضبط کی جاتی ہے۔ یعنی آج بلوچ اور بلوچستان، نام، قابل نفرت قرار دیا گیا

قیادت نے کنونشن کے نام پر کراچی میں کوششیں شروع کیں، جس کی تفصیل ہم نے اور دیگر بلوچ دانشوروں نے مختلف مواقع پر بیان کئے، جب کہ طلباء کھل کر دو دھڑوں میں تقسیم ہوئے اور اس کے بعد بلوچ نیشنلزم کے مقابلہ طلباء کی تنظیمیں پاکستانی سیاست کے پارلیمانی گریوں کے دست وباز وزیادہ رہے۔ کوئی ڈاکٹر مالک گروپ، دوسرا سردار عطاالله، تیسرا بہ ہدا غ، چوتھا حیر بیار پانچواں ڈاکٹر اللہ نظر اوراب سیاسی تقسیم تعلیم کی طرح بلوچ طلباء بھی درجنوں تقسیم ہیں، اوراسی بناپر سرکار کے آسان شکار بھی ہیں۔

ہمگام۔ گزشتہ کچھ عرصے سے آپ کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ھے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجه ھے؟

صورخان مری۔ اس سوال کے جواب کو معروضی انداز میں سمجھنے کے لئے ہمیں پاکستان اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بلوچ اور بلوچستان کے حوالے سے بحث مباحثہ اور تحریروں کی بابت رویے میں نظر ڈالنا ہوگا، جہاں تک میرے لکھنے پڑھنے کا سوال ہے، جس کے پس منظر میں سرکار پاکستان کے رویے کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے، میں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی "بلوچی" میں لکھنا شروع کیا تھا، ابتدائی ایک آدھ افسانوں کی موضوع کے علاوہ، افسانوں اور دیگر تحریروں کا موضوع بلوچ نیشنلزم ہی تھا، افسانوں میں "پروش ءِ سوب" "بوے بوے آدمی"" کپ ءِ لپ" وغیرہ براہ راست سرکار پاکستان کے بلوچوں پر انسان سوز مظالم اور بلوچ مزاحمت کے موضوع لئے ہوئے تھے، دلچسپ یہ کہ بیشتر افسانے اور تحریریں سرکاری رسالہ اول میں ہی چھپے، ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر اس بابت لازم ہے۔ نام لینا مناسب نہیں۔ ایک بلوچ شخصیت "ریڈیو" پاکستان ملنے آئے تو فخریہ بولے "ہمارا یہاں سرکاری ادارہ آنے پر آپ لوگوں پر بُرا اثر تو نہیں پڑیگا" یہ زمانہ 1960 کی دہائی کے بلوچ انسرجنسی کا تھا، میرے سامنے اس دن شام بلوچی کے پروگرام کے "ٹیپ" رکھے تھے۔ پروگرام تفصیل کے ساتھ وہ ٹیپ اٹھا کر اس شخصیت کو ٹیپ ریکارڈر کے پاس لے گیا، اور وہ مخصوص "انٹرویو" سنایا۔ جو بلوچ سرمچاروں کے بارے میں توصیفی اشعار پر تھا۔ اس شخصیت کو مخاطب کر کے کہا" جائیے! ان اشعار اوراس مناسبت کی باتیں سرعام کیجیے جس طرح شام کو یہ" انٹرویو" عام سننے والوں کے لئے سنوایا جائیگا۔

آج اکیسویں صدی کا" کھلاپن، گلاسنوسٹ"اور نجانے کیا کچھ دعوے لئے جاتے

ہیں۔ڈاکٹر مالک اور نیشنل پارٹی کی سرکار ہے۔کتاب خانوں پر چھاپے کے دوران انگریز سرکار کے عہد کے 1902 کے لالہ ہتھورام کی تاریخ بلوچستان ضبط کی جاتی ہے۔ یعنی آج بلوچ اور بلوچستان ،نام ،قابل نفرت قرار دیا گیا ،فرق یہ ہے ،ایوبی مارشل لاء، بھٹو یا دیگر بلوچوں پر مظالم کے تمام عہد میں بلوچ ،بلوچوں کے خلاف "سلطانی گواہ" مقصود تھے۔اور آج سلطانی گواہ برسر اقتدار اور خواہش اقتدار رکھتے ہیں۔(جتنا بڑا سرکار یا پاکستان کا وفادار اور سلطانی گواہ ہوگا،اسی حساب سے اس کے ترتیب کا سرکار یقین کرتا ہے۔کسی کو محض لیویز کے سپاہیوں کے گھوسٹ تنخواہ پر پالتا ہے،کسی کو دیگر حوالوں سے نوازتا ہے،کسی کو ایم پی اے ،سینٹر ،وزیر اور چیف سینٹر ،وفاقی وزیر یہاں تک کہ وزیر اعظم اور صدارت پر مطمئن کرتا ہے،بلوچستان کو 1948 فوج نے فتح کیا۔اس فتح کے حوالے سے آج تک بلوچستان کی اصلی حاکمیت فوج اور فوجی اداروں کی ہے،آج فوجی کمانڈر کھل کر کھلے عام اپنی حاکمیت کی نمائش ہم اپنی کھلے آنکھوں دیکھ رہے ہیں)نتیجہ آپ کے سامنے ہے روزنامہ انتخاب کے ایڈیٹر نے ایک کالم میں حاصل خان کے حوالے شاعر غالب کی بات دہرائی تھی ۔"ہم بھی پیٹ رکھتے ہیں" روزنامہ توار کے نیوز ایڈیٹرز کا اغوا اور لاش ،کس گناہ کے لئے سزا تھا۔2007 کے اواخر یا 2008 کے اوائل ،بغیر کسی حجت کے ایم آئی کے کرنل حفاظت نامی شخص کھل کر مجھے فون پر دھمکانے کی کوشش کرتا ہے،اس پس منظر میں اخبارات کے مالکان اور مدیروں پر کیا گزری ہوگی،اور روزنامہ استمان ،روزنامہ آساپ ،کئی رسائل کو بند کیا گیا۔وسائل محدود کئے گئے ۔آج بمشکل بلوچ اور بلوچستان پر کوئی معروضی بحث مباحثہ میڈیا میں ممکن ہے۔گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کے سینئر صحافی اور جیوٹی وی چینل

برادری" پر ایک تحریر متنازعہ بن گئی تھی۔تو لاہور کراچی انگریزی روزنامہ نے چھاپنا بند کر دیا۔ساؤتھ ایشیا منیٹر نے ڈاکٹر مالک حکومت اور زیارت قائد پاکستان عمارت کی تباہی کے بارے میں لکھنے کو کہا،ایسی معلومات کے مطابق کوشش کی تھی،صحیح اور معروضی بات کریں،بی آر پی کے پس منظر میں "بگٹی پالیٹکس" اور بلوچ نیشنلزم اہم نظر اندازیاں ،کمزوریاں" کے عنوان سے ایک طویل تحریر بھی قابل اشاعت قرار پائے۔ البتہ یہ تمام فیس بک پر http//Suratkmarri@log.com موجود ہیں۔ ایک مقامی ادارہ نے تمام انگریزی مضامین کو کتابی صورت میں چھاپنے کا کہا،پیش نظر بھی عرصہ ہوا لکھ کر بھیج چکا کتاب کا نام "THE SERVILE BALOCH RESISTANCE" تجویز ہے،اب دیکھیں کب چھپے گا۔۔

ہمگام۔بحیثیت سیاسی نقاد کے آپ کی بلوچ سیاست پہ گہری نظر ہے۔موجودہ سیاسی صورتحال کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

صورت خان مری۔سیاسی نقاد یا نقاد و تنقید نگار مناسب ترکیب مجھے اچھا نہیں لگتا، نقاد،ادیب اور شاعر کیلئے لازم نہیں اسکا کوئی معروضی قومی وابستگی اور کمٹمنٹ ہو،مجھے یاد ہے عطا شاد کی پہلی برسی پر ان کے قریبی ملنے والوں کو اکٹھا کیا گیا،مقامی روایتوں

بی ایل اے نے 2001 / 2000 میں معروضی طور پر تحریک کی نئی ابتدا کی تھی۔معروضیت ہی کی بناء پر دنیا چونک گئی تھی۔ بلوچ معاملات سے دلچسپی رکھنے والے عالمی شہرت سے ماہرین کی تحریریں اور بحث مباحثہ ریکارڈ پر ہے

کے اینکر پرسن حامد میر پر قاتلانہ حملہ مبینہ طور پر اس بنا کر ہوا تھا کہ انھوں نے بلوچ مسنگ پرسن کے بارے میں پروگرام کئے تھے اور لکھا تھا،چنانچہ اکثر و بیشتر اخبارات اور رسائل نے بلوچ اور بلوچستان کی بابت تحریروں کو چھاپنے سے انکار کیا۔اس کے علاوہ بلوچ سیاسی تنظیموں اور عسکری تنظیموں کے اختلاف بھی معروضی بحث مباحثہ کی راہ میں حائل ہیں،بہرحال ایسا بھی نہیں کہ ہم نے لکھنا اور بحث و مباحثہ چھوڑ دیا،البتہ بلوچستان یا پاکستان کے اخبارات چھاپنے سے معذور ہیں،الیکٹرانک میڈیا یا دیگر میڈیا" کمرشل" اور کاروباری ہیں،لہذا بلوچ اور بلوچستان پر معروضی بحث و مباحثہ پاکستان میں تقریباً ناممکن ہے۔جب اردو میں لکھنا ممکن نہ ہوا تو ہم نے انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔لاہور کراچی کے ایک روزنامہ نے شروع میں چھاپے اور انڈیا کے نکلنے والے "ساؤتھ ایشیا منیٹر" نے اس روزنامہ سے کئی مضامین نقل بھی کئے۔البتہ "ہزارہ

کے ماتحت مرحوم کی جا و بجا تعریفیں کی جاتی ہیں۔میں نے عبدالکریم بلوچ ،جس نے عطا شاد پر پہلی کتاب لکھی تھی،مخاطب کر کے پوچھا،عطا شاد کی وابستگی اور کمیٹمنٹ کیا تھی؟حکیم بلوچ نے فوراً کہا" کچھ بھی تو نہیں" وہ پاکستان سرکار سے تین تعریفی تمغے حاصل کرنے والے تھے۔سلیم احمد کے پورا آدمی اور شاعری اور اردو شاعروں سے متاثر انہی کے ہاں قبولیت کے خواہاں رہے۔انہیں سیاسی وابستگی سے نفرت تھی اور انہوں نے تحریری طور پر اظہار بھی کیا تھا،جو بلوچی مضامین کے ایک مجموعہ میں موجود ہے۔چنانچہ میں سمجھتا ہوں،ہماری بلوچ نیشنلزم کی وابستگی ہے،2004 کو بیس سالوں بعد اور غالباً وہ نواب خیر بخش کی آخری عوامی پلیٹ فارم پر خطاب تھا۔انہوں نے کھلے عام دو مرتبہ کہا تھا،صورت خان نے بلوچ نیشنلزم کے بارے میں جو بحث مباحثہ شروع کیا ہے،چاہیے یہ تھا،ہم اپنی سیاست کے ابتدا،ایسی بحث مباحثہ سے وابستگی

نکالتے ۔بلوچ قومی تحریک کی بابت کافی کچھ لکھ چکا ہوں ۔بی ایل اے نے 2001 / 2000 میں معروضی طور پر تحریک کی نئی ابتدا کی تھی ۔معروضیت ہی کی بناء پر دنیا چونک گئی تھی ۔بلوچ معاملات سے دلچسپی رکھنے والے عالمی شہرت سے ماہرین کی تحریریں اور بحث مباحثہ ریکارڈ پر ہے ۔جن میں تحریک کو معروضی اور منظم اور عوامی فتح قرار دیا تھا ۔البتہ فوری طور پر بلوچ پارلیمانی سیاست کے منحرفین بالخصوص نیشنل پارٹی ،ڈاکٹر مالک نے کافی سے زیادہ سرگرمی دیکھائی اور بلوچستان نیشنل پارٹی ،سردار عطا اللہ خان لندن سے سامان لپیٹ کر واپس پہنچ گئے تھے ،دوسری طرف گیس کی بابت 1953 کا پچاس سالہ معاہدہ ختم ہونے کو آرہا تھا ،جے ڈبلیو پی ،نواب اکبر خان بگٹی ایک قابل قبول نئے معاہدہ کے لئے سرگرم ہو چکے تھے ،چنانچہ اس نے چار جماعتی اتحاد کے نام سے بی ایل اے کی قومی آزادی تحریک کے رخ کو بدلنے اور سبوتاژ کی بابت سر توڑ کوششیں شروع کیں ۔قومی آزادی کی بجائے قومی محرومی ،ساحل و وسائل ،پروپگنڈہ شروع کیا اور اسٹیبلیشمنٹ سے مذاکرات کی خواہشات کے لئے سرگرم عمل ہوئے ۔آج جس تقسیم در تقسیم اور ناکامی کا جو دور دورہ ہے ،اس پر بھی متعدد بار ہم تحریری اظہار خیال کر چکے ۔اور بین الاقوامی انقلابی تحریکوں کی تقسیم در تقسیم اور ناکامی کے حوالے یہاں تک لکھ چکے تھے ۔وہ یہ کہ آگے چل کر یہ گروپ آپس میں ٹکرائیں گے اور (توبہ نعوذ باللہ) اگر اللہ تعالیٰ بھی درمیان میں آجائے تو اس باہمی کشیدگی اور ٹکرائے جانے کو روک نہیں سکیں گے ،یہی بات ہم نے نواب خیر بخش مری کے ساتھ ایک بات چیت میں دورائی تھی ،آج جس رخ پر بلوچ قومی تحریک کے نام پر سرگرمیاں ہیں وہ باعث فخر نہیں ،کینچا تانی کی ابتدا چھپائے نہیں چھپائی جاسکتی ۔اور پھر عالمی سطح پر اجتماعی بلوچ قومی تحریک کو "نچلی سطح "LOW INTENSITY" کی انسرجنسی بتائی جاتی ہے ،عالمی ماہرین کا اتفاق ہے ،وہ یہ کہ نچلی سطح کی انسرجنسی ایک حکومت بدلنے کی سکت نہیں رکھتی ،اور قومی آزادی ،ایک عوامی مقبولیت کی انتہائی منظم جدوجہد چاہتی ہے ،ایک بے انتہا سرگرم عمل طلسماتی رہنما اور قیادت ضروری ہوتا ہے ،یہاں بلوچ قومی آزادی کا پیغام صوبہ بلوچستان سے باہر پنجاب سندھ کے بلوچوں تک نہیں پہنچائی جاسکتی ،ایران افغانستان اپنی جگہ پر ،ہم نے ایک انگریزی تحریر "BALOCH NATIONALISM ; NEGLECTS" کے عنوان سے کوشش کی تھی ۔جن نکات کو قومی سطح پر نظر انداز کیا جاتا رہا ،ان پر بحث کر سکیں کہیں چھپ نہیں سکا ،فیس بک پر موجود ہے ہم میں کئی کمزوریاں رہیں ،مواقع ملے تو رد نہیں کیے گئے ،نمائشی اور ذاتی جلسوں کو فوقیت دی گئی ،ہم جب مظاہروں ،سیمیناروں ،ریلیوں اور انفرادی رہنما یانہ خواہشوں کی مخالفت کرتے تھے تو ناراضگیوں کا اظہار ہوتا رہا ۔اندازہ کیجئے ،میڈیا اور مقامی پریس بلوچ نیشنلزم کی باعث تحریریں چھپانے سے انکاری تھے ۔انفرادی بیانات جو تکرار ہی ہوتے ہیں ،یا مظاہرے وغیرہ کی بھرپور کوریج ہوتی ہے ،یہی حال ہڑتالوں کی ہے ۔ایک مرتبہ واجہ خلیل سے اس بابت بات ہوئی تو بتانے لگے کہ پاکستان کی معیشت پر ضرب لگانا مقصود ہے ،(گوادر ،سیندک ،ریکوڈک ،گیس ،چمالنگ ،وغیرہ زیر بحث نہیں) مختصراً یہ کہہ سکتے ،علمی بلوغت اور معروضیت کی اولیت کو وہ مقام نہیں دے سکے ،جس کی قومی انقلابی تحریکوں کے لئے لازم ہیں ۔

ہمگام ۔بلوچ جُہد آزادی کا آپ ماضی اور حال کے تناظر میں کس طرح تجزیہ کریں گے؟

صورت خان مری ۔اس سوال کا جواب کافی طویل ہے ،اگر ممکن ہو تو فیس بک سے "BALOCH NATIONALISM ; NEGLECTS" لیکر الگ سے چھاپ لیں ،دیکھیے ،یہ جو کہتے ہیں قومی آزادی (دیگر مساوالات) کا حصول اتنا مشکل نہیں جتنا اس کو معروضیت کے ساتھ برقرار رکھنا مشکل ہے ،بلوچ قومی ریاست کی آزاد حیثیت میں حاکموں اور منارکی نے اپنی حاکمیت کو اولیت دی تھی ،مغلوں اور دیگر بادشاہوں کی مانند گھریلو اور خاندانی مناقشیں رہیں ،یہاں تک ایک مقام پر دفاع (مزاحمت) کے حوالے سے "فوج" تک نہ رہا اور 1948 قومی مزاحمت نہ ہوسکی (سیاسی قیادت کا انحراف زیر بحث نہیں) اور جب مارچ 1948 پاکستان نے حملہ کیا ۔تو ایک دو دن کے اندر خان قلات احمد یار خان نے ہتھیار ڈال دیئے اور الحاق کے کاغذات پر دستخط کیے ،آغا عبدلکریم کی بغاوت کا قدرت نیشنل پارٹی کی سیاسی قیادت کے منحرفین نے ساتھ نہیں دیا ۔نواب نوروز خان ریاست قلات کی بحالی چاہتے تھے ،1960 کی دہائی کی ابتدا نواب خیر بخش ،شیر محمد ،سردار عطا اللہ خان اور دیگر

> **ہم جب مظاہروں ،سیمیناروں ،ریلیوں اور انفرادی رہنمایانہ خواہشوں کی مخالفت کرتے تھے ،تو ناراضگیوں کا اظہار ہوتا رہا ۔اندازہ کیجئے ،میڈیا اور مقامی پریس بلوچ نیشنلزم کی باعث تحریریں چھپانے سے انکاری تھے ۔انفرادی بیانات جو تکرار ہی ہوتے ہیں ،یا مظاہرے وغیرہ کی بھرپور کوریج ہوتی ہے ،یہی حال ہڑتالوں کی ہے ۔ایک مرتبہ واجہ خلیل سے اس بابت بات ہوئی تو بتانے لگے کہ پاکستان کی معیشت پر ضرب لگانا مقصود ہے ،(گوادر ،سیندک ،ریکوڈک ،گیس ،چمالنگ ،وغیرہ زیر بحث نہیں)**

سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور طلباء نے قومی آزادی کے نام سے کی، آگے چل کر سیاسی مفادات کی شکار ہوئی۔1970 کی انسرجنسی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت کی بحالی، بلوچ قومی آزادی سوشلسٹ انقلاب کے تشکیل کے گرد گومتی رہی۔بی ایل اے انتظامی یونٹ کو ایک الگ مملکت بنا کر قوم عرب کو تقسیم کیا گیا، اور اگر بلوچ ہر عسکری گروپ کے زیر اثر ایک سیٹلائیٹ مملکت بنوائی جانا مقصود ہو۔کونسی قوت روکے گی، آج بلوچ قوم جس مظالمانہ فوجی آپریشن سے گزر رہی ہے، خواتین، بوڑھے اور

کیا بی این ایم کا ایک دھڑا اور بی ایس او آزاد کا ایک دھڑا، ہی بلوچ نیشنل (قومی) فرنٹ ہے؟؟؟

نے 2000/2001 میں معروضی طور پر قومی آزادی کی تحریک شروع کی، آج آپ خود تحریک اور قیادت کے اختلافات کی پوچھ رہے ہیں، وہ جو کہاوت ہے " کوئی کہے، ہم بتائیں کیا" انفرادی سیاسی خواہشات، نمائش، گروہی مفادات، ہم نہیں کہہ سکتے، عالمی سیاسی تجربات اور تاریخ کو کیوں نظر انداز کیا جارہا ہے۔ہم افغانستان کے حوالے سے سوویت یونین کے خلاف جہادی تنظیموں (سنی، شعیہ) کوئی ڈیڑھ درجن گروپ تھے اب تحقیقاتی کتابیں موجود ہیں، ہر گروپ کی سرپرستی کوئی اور کرتا رہا، اب بلوچ گروپس سیاسی اور عسکری ڈیڑھ درجن سے زیادہ ہیں، اللہ خیر کرے یہاں تک کہ بی ایل اے اور بی ایل ایف تک کوئی نہیں بچایا جا سکا؟

ہمگام۔ بلوچ سیاسی اکابرین کے درمیان اختلافات اور قومی تحریک میں تضادات کے حوالے سے آپ نے اپنی تحریروں میں بہت کچھ لکھا ھے۔ قومی تحریک کے موجودہ دور بھی آزادی پسند رھنماؤں اختلافات اور بعض امور پر تضادات ابھر کر سامنے آرھے ھیں۔ اس حوالے سے آپ کیا تجزیہ کریں گے؟

صورت خان مری۔ اردو محاورہ ہے "چھوٹا منہ، بڑی بات" نہیں کہہ سکتا، علمی بلوغت کا فقدان ہے، معروضیت، تاریخی تجربات کو نظر انداز کیا جارہا ہے، اور پھر کبھی کبھار ذاتی گروہی مفادات آنکھوں پر پردہ ڈالتا ہے، کھلی آنکھوں سے پارلیمانی سیاست کی پاکستان ایجنٹوں کے تابع حکم، جو جس قدر سرگرم عمل ہے، اسی قدر "دست دعا" پا رہا ہے، بلوچ طلباء کی تقسیم در تقسیم کی وجوہات پر نظر ڈالیں۔بڑی حد تک قومی سطح کے نفاق کی طرف نظر جا سکے، خدا کرے ایسا نہ ہو، اگر کل کلاں بوجہ سامراج کی قومی تقسیموں پر نظر ڈالیں، عالمی طاقتیں اگر چاہیں تو عرب دنیا کی طرح جہاں ہر

معصوم بچے نشانہ بن رہے ہیں، سادہ لباس میں ملبوس ایجنسیاں جس طرح سیاسی کارکنوں کو اغوا کر کے غائب کر رہے ہیں (یہاں سیادہ لباس میں سیاسی کارکنوں کے کرنے کے حوالے سے ہم نے مزاحمت نہ کرنے پر، مری اتحاد کے پریس ریلیز اور پروپیگنڈہ پر شدید تنقید کی تھی۔رحم دلی کا احساس ابھارنے کے لئے وہ بیان کرتے تھے، کہ گاڑی میں سادہ لباس فورسز آتے ہیں، جس سے ورنہ بھاگ کر پہاڑوں کے دامن چھپ جاتے ہیں، خواتین بچے اور بوڑھے ان مظالم اور تشدد کا نشانہ بنتے ہیں تو ہم پوچھتے تھے، سادہ لباس کی مزاحمت کیوں نہیں ہوگی، البتہ المیہ یہ ہے، کسی قومی منظم سیاسی تنظیم کے فقدان کے بنا پر کوئی پالیسی بھی تو نہیں، بیچارے عام کارکن کیا معروضی فیصلہ کر سکیں گے) چنانچہ بلوچوں کے خلاف روز بروز بڑھتے فوجی آپریشن، قتل و غارت گری، اغوا، اور لاشوں کے پھینکے جانے، اجتماعی قبریں، موجودہ حکومت کا اعلانیہ نام نہاد "شر پسند" کے خلاف بھرپور کاروائیوں کا اعلان، یہ تمام بلوچ سیاسی و عسکری قیادت کے گروپ بندی، چپقلش اور نفاق پر قابو پانے اور آنکھیں کھولنے سے اگر قاصر ہے تو نہ جانے وہ کس اسرافیل کے سور پھونکنے کا انتظار کر رہے ہیں، فقط اخبارات کے دو لائین رپورٹ کیلئے زندہ رہنا مقصد نظر آنے لگا ہے، ایک بی این ایف بنا تھا۔بعد میں نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ بعض کو نکالا گیا، یا خود نکل بھاگے، اب بی این ایم کا ایک دھڑا اور بی ایس او آزاد کا ایک دھڑا ہی تو بلوچ نیشنل (قومی) فرنٹ ہے؟ (اگر یہی حالت برقرار رہی تو مایوس کن ہی کہلایا جائیگا۔ایسے میں کون کم بخت عالمی حمایت کی توقع کریگا، اور ہم سمجھتے ہیں، یہی نفاق اور گروپ بندی ہے کہ تمام تر انسانی حقوق کی پائمالیوں کے باوصف عالمی رائے عامہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اخباری رپورٹوں پر تکیہ ہے، اقوام متحدہ بلوچ نمائندگی (کس گروپ کی) عالمی انسانی حقوق تنظیم بلوچ قوم کی نمائندگی، سوال پیدا ہوتا ہے، کیا عالمی تنظیمیں اور عالمی طاقتیں اندھے اور بہرے ہیں جو بلوچ سیاسی پیش رفت سے واقف نہیں، کل کلاں عالمی سطح پر مذاکرات "یا" بلوچ مسئلہ سمجھنے کی بابت پیش رفت ہو۔کون قوم بلوچ کی نمائندگی کا حقدار ہوگا، ہم آخر میں پھر دہراتے ہیں، اختلافات اور گروہ بندی کی وجوہات کیا ہیں؟، کیوں سرگرداں بلوچ عوام کو اعتماد میں نہیں لیتے؟ اور اختلافات کے وجوہات نہیں بتاتے؟)

ہمگام۔ بلوچ سیاست میں خصوصاً آزادی پسندوں کے درمیان اختلافات کو مدنظر رکھ کر اگر جائزہ لیا جائے، تو بلوچ اتحاد و یکجهتی کا خواب پورا هوتا نظر نهیں آتا۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے هے؟

صورت خان مری۔ غالباً علمی سیاسی بلوغت کی کمی ہے، اور تاریخ تجربات پر نظر

یہی نفاق اور گروپ بندی ہے کہ تمام تر انسانی حقوق کی پائمالیوں کے باوصف عالمی رائے عامہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اخباری رپورٹوں پر تکیہ ہے، اقوام متحدہ بلوچ نمائندگی (کس گروپ کی) عالمی انسانی حقوق تنظیم بلوچ قوم کی نمائندگی، سوال پیدا ہوتا ہے، کیا عالمی تنظیمیں اور عالمی طاقتیں اندھے اور بہرے ہیں جو بلوچ سیاسی پیش رفت سے واقف نہیں کل کلاں عالمی سطح پر مذاکرات "یا" بلوچ مسئلہ سمجھنے کی بابت پیش رفت ہو۔ کون قوم بلوچ کی نمائندگی کا حقدار ہوگا،

نہیں رکھی جارہی، ایک طرف انیسوی صدی کی گلاسنوسٹ اور کھلا پن ہے، دوسری طرف شتر مرغ کی مانند "سر جھاڑی میں دبا کر" سمجھا جاتا ہے اس کو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے حالانکہ ہر کسی کو اسکا پورا دھڑ نظر آرہا ہے، بلوچ سیاسی گروپس اور عسکری دھڑے دولائین کی اخباری رپورٹ کے سائے تلے قومی آزادی کا خواب دیکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، یہی گروپس اور دھڑے سیاسی کارکنوں کے اغوا اور ویرانوں میں پھینکے لاشوں اور دیگر مظالم کے براہ راست ذمہ دار ہیں۔ وہ یہ کہ یہ قیادت معروضی رہنمائی کے قاصر رہا، خود فریبی اور نمود و نمائش قومی آزادی نہیں دلا سکتے، آپ کے تحفظات بجا ہیں۔

ہمگام۔ عالمی سیاسی و معاشی مفادات اور معروضی حالات میں بلوچ گل زمین نے ایک اهمیت کے حامل خطے کی حیثیت اختیار کی هے۔ آج افغانستان میں امریکه کی موجودگی، چین کی گوادر میں براجمان هونے، ایران کی سیاسی و معاشی حوالے سے اقدامات اور پاکستان کے بلوچ سرزمین پر اپنی تسلط کو برقرار رکھنے کے پیش نظر صورتحال دن به دن ایک پیچیده صورت اختیار کرتی جارهی هے۔ اس صورتحال کو آپ کس نظر سے دیکھتے هیں؟

صورت خان مری۔ قوم اور قومی گل زمین، بلوچ کا ہو، یا کسی دیگر کا، یکساں اہمیت کے حامل ہیں، آپ نے اکبر بیربل کا قصہ سنا ہوگا، خوبصورت ترین بچوں کا مقابلہ، سب سے زیادہ ماں باپ جس بچے کو لپٹ لپٹ کر بے انتہا پیار کر کے خوبصورت ترین قرار دے رہے تھے، حاضرین کی نظر میں سب سے میلا کچیلا اور بدصورت ترین بچہ تھا، ماں باپ کی حد نظر آسمانوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کی وابستگی کے بنا " بیربل " نے اس کو سب سے خوبصورت قرار دیکر بادشاہ کے سامنے پیش کر کے "جواز" بھی بیان کیا۔ آزادی ایک قومی وابستگی کا انسانی بنیادی حق ہے۔ حب الوطنی، ماں باپ کا بچہ کے لئے قدرتی اور فطری وارفتگی ہے، جس قدر بلوچ اپنی گل زمین کی وابستگی اور وارفتگی رکھتا ہے، وہی پشتون، ازبک، یورپی، امریکی، افریقی، کوئی اور بھی ہو رکھتا ہے، وائے وطن ہشکیں دار، ملک، منان اوماہین، دل ارماہین، ہر قوم کے لئے یکساں ہے، قومی آزادی کا حصول کسی ریفرنیڈم یا رائے کا محتاج نہیں، ہم عموماً انسانی زندگی کے حق کے مشابہ، قومی آزادی کے حق کو قرار دیتے ہیں، جہاں انسانی زندگی کے حق اور قدر کو لے کر "قتل رحم دلی" تک کو ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شکستہ دیوار.......پیغام بہت
بی ایل ایف کے رویوں کے تناظر میں

شاہ جی بلوچ

بلوچ جد وجہد کےاس پانچویں مرحلے پرایک بات بیااہم طور پرمحسوس کی جاسکتی ہے کہ یہاں جہدکاروں اوراس جد وجہد کے ذمہ داروں کے پاس کہنے کیلئے بہت کچھ ہے جبکہ اس سے قبل ذمہ داررہنماءزبانوں پرقفل لگائے رکھنے میں عافیت جانتے رہے ہیں،یاد کرنے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے جہاں پچھلے ادوار میں کیا ہوا کیوں ہوااور کیسے ہوااس کےنقصانات کی کسی رہنماء نے ذمہ داری تک نہ لی،البتہ سردارعطاءاللہ مینگل اپنے دیگرہم عصرذمہ داروں سےاس حدتک عیار نکلے جہاں انہوں نے پنجابی انخلاءاور کسی حدتک جد وجہد کا کریڈٹ لینے میں کسی پس وپیش سے کام نہ لیااوراس بابت ایک پہچان پاگئےاورزمانہ امن کے دہائیوں پرمحیط سالوں میں وہ اس کریڈٹ کوعوامی سیاسی مقتدرہ بننے کےطورپر لیتے رہے سیاسی فوائدسمیٹتے رہے۔تاوقتیکہ اس کریڈٹ کےاعادہ کےطورپرآخری نعرہ ''راج کرے پنجاب رے بھیا راج کرے'' کوابھارنے کی کوشش بھی ضرورکی۔البتہ وقت وحالات نے اس نعرے کوسردارعطاءاللہ مینگل کے حق میں زیادہ استعمال نہ ہونے دیا کیونکہ اختر مینگل کی حکومت کے خاتمے پر جہاں سردارمینگل نے پونم بنائی اوراس نعرے کوعام کرنے کی کوشش کی تو ساتھ ہی دنیا کی 9/11 جیسے واقعات کیساتھ تبدیلی اوربلوچ جد وجہد کی نئی احیاءکی بلوچ لبریشن آرمی (بی ایل اے) کےطورپرظہورکیساتھ سردارعطاءاللہ مینگل اپنے اس نعرے پرزیادہ زورنہ دے سکے نعرے کریڈٹ لینے کیلئے تخلیق کئے جاتے ہیں جبکہ اس نعرے کابی ایل اے کی پنجابی انخلاءسےاپنی جد وجہد کے آغاز کےمیل ملاپ سے ممکنہ طورپر کریڈٹ کیساتھ ساتھ مضمرات کابھی سردارمینگل کے حق میں جانا خارج ازامکان نہیں تھا گویاسردار عطاءاللہ مینگل کا یہ نعرہ ازخود دبادیا گیا۔چنانچہ پچھلےادوارکی جد وجہد کے منافع خور سردار مینگل رہے جبکہ نقصانات اورمضمرات ان سب کے حصے میں آگئے جواس جد وجہد کوآگے بڑھانے کیلئے بلوچستان سے تاریخی ہجرت کی۔گویاآج کی جد وجہد میں کریڈٹ لینااس لئے بھی آسان نہیں رہا کیونکہ اس جد وجہد کا کریڈٹ لینے سے پہلے ذمہ داری لینے کارجحان پنپ چکا ہے چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹراللہ نذرکے مردآہن،چے گویرا،براہمدغ بگٹی کے نواب لاحقے کے استعمال پرزوردینے سمیت میرجاوید مینگل کابھی کسی حدتک انگلی کٹاکرشہیدوں میں نام لکھوانے کی کوشش کے برعکس ان کے ہاں ''ذمہ داری'' لینے کی بابت کوئی امرنہیں۔تنظیموں اورشخصی پہچان پر پوری توجہ رکھنے کے باوجود ڈاکٹراللہ نذر یہ موقف رکھتے ہیں کہ سردارونوابوں کاتحریک میں کوئی مقام نہیں اوریہ کہ نواب خیربخش مری واحدسردار ہیں جوآزادی پسند ہیں۔اس موقف میں وہ سب سے پہلے آزادی کی جد وجہد کے ذمہ دارسرداروں کوسمجھتے ہیں اور محض نواب مری کوآزادی پسندقراردے کراسے حیران کن انداز میں پیش کرتے ہیں۔عام طورپر یہ سوال کیونکرسامنے آسکتا ہے کہ سردارونواب کیونکرآزادی کی تحریک کیلئے لازمی امرہیں البتہ پچھلےادوارکے دورانیوں میں سردارونوابوں کی شمولیت کے تناظر میں یہ سوال سامنے آسکتا ہےپھراس سوال کوجواب کیساتھ مکمل کرکے دیکھا جائے تو سردارمینگل کے پچھلے ادوار میں شمولیت ناقابل تردید ہےتوآخری تجزیہ میں وہ منافع خوربھی رہےاورکریڈٹ لینے سے انکارنہیں کیااورخودان کےالفاظ میں کہ ''اگرکوئی انہیں (سردارمینگل کو) پنجابی انخلاءکاکریڈٹ دیناچاہتا ہےتو وہ ضرورلیں گے''بعد ازاں اس کریڈٹ کےاثرات کومزید مہمیز کرنے کیلئے انہوں نے ''راج کرے پنجاب رے بھیاراج کرے'' کا نعرہ بھی دیا۔اب یہ پچھلے دورکا سوال اپنے جواب کیساتھ کسی

> **بی ایل ایف کے ہاں ایک فرد حیربیار کوجسے بی ایل ایف بغیر پارٹی بغیر پلیٹ فارم سمجھتی ہےاس کودشمن قراردینے کیلئے باقاعدہ طورپرتنظیم کے سپریم کونسل کااجلاس منعقد کرتی ہےسپریم کونسل کے ارکان کوبلوچستان بھرسے یکجا کرنااورون پوائنٹ ایجنڈے پر فیصلہ لینادوسری طرف قیادت سمیت سیاسی انتظامی اورعوامی سطح کے بحرانات پرمحض ترجمان کے بیان سے کام لینے کے فرق کوبخوبی سمجھا جاسکتا ہے جبکہ حیربیارمری کوفرد سمجھ کرکیونکرسپریم کونسل کے اجلاس کی ضرورت پیش آئی۔**

حدتک مکمل دکھائی دیتا ہے کہ سردار مینگل نے حصہ لیا اور کریڈٹ بھی لینے سے انکار نہیں کیا چنانچہ ذمہ داری کی تو سردار مینگل بات ہی نہیں کی۔یقیناً جہاں ذمہ داری کی بات آتی ہے تو وہاں کریڈٹ بعد کا مرحلہ ہوتا ہے اور ایسی جدوجہد (1973) جو اپنے دورانیہ کے طور پر (تسلسل نہیں) نا کام قرار دی گئی ہو اس میں کریڈٹ کیسا؟؟؟؟

حالیہ جدوجہد اپنے درمیانی مراحل میں ہے چنانچہ کریڈٹ سے پہلے ذمہ داریوں کی بات کرنا زیادہ منطقی معلوم ہوتا ہے، جبکہ کریڈٹ کامیابی سے مشروط ہے لہٰذا پہلے پہل ذمہ داریوں کا تعین ضروری ہے اور ذمہ داریوں کا تعین اس لئے بھی کہ ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر کے بی ایل ایف کے قائد بننے سے متعلق سپریم کونسل کے اجلاس اور اس اجلاس میں طویل بحث ومباحثہ اور ووٹنگ کے ذریعہ انتخاب سے لے کر تمام رسومات کی ادائیگی کا عوامی سطح پر کوئی ذکر موجود نہیں اور قیادت سنبھالنے جیسی بنیادی ذمہ داری کا رسمی طور پر کہیں اعلان نہیں کیا گیا جبکہ حیربیار کو تحریک کیلئے خطرہ قرار دینے کیلئے انہوں نے بطور قیادت ذمہ داری لینے سے قطعی گریز کیا بلکہ رسمابی ایل ایف کے سپریم کونسل کے اجلاس کا تاریخ کیساتھ عوامی سطح پر پریس ریلیز جاری کی گئی۔میرے نزدیک حیربیار کو تحریک کیلئے دشمن قرار دینے سے زیادہ بی ایل ایف کی قیادت کی ذمہ

مرد آھن ،چے گویرا کتاب سے رھنمائی لینے اور تنظیمی سربراھی کے اعلان کے طورپرڈاکٹر الله نذر کریڈٹ لے چکے۔سرداروں کے بڑے پیمانے پر جدوجھد میں عدم شمولیت کوحیران کن قرار دے کراور حیر بیارمری کو تحریك کیلئے نقصاندہ قرار دینے کا جوموقف ڈاکٹر الله نذر اپنا چکے ھیں۔(دیکھو سردار نھیں توھم جیسے مڈل کلاس آئے) اس تناظر میں کریڈٹ لینے کے عوامل واضح ھیں لیکن ذمہ داری لینے کا کوئی ایك موقف سامنے نھیں آیا

جدوجہد کو شدید جانی ومالی نقصانات کا سامنا ہونے کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور انتظامی نقصانات کا بھی سامنا ہے۔سب اچھا ہے کہہ کر وہ تعفن چھپائے نہیں چھپ رہا جو غیر دانشمندانہ رویوں کے باعث پھیل گئی ہے اس تعفن کی جڑیں حالیہ جدوجہد کے دورانیہ میں کریڈٹ لینے سے ہے جبکہ یہاں ذمہ داری لینے جیسا اہم امر کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جارہا ہے۔مردِ آہن، چے گویرا کتاب سے رہنمائی لینے اور تنظیمی سربراہی کے اعلان کے طور پر ڈاکٹر اللہ نذر کریڈٹ لے چکے۔سرداروں کے بڑے پیمانے پر جدوجہد میں عدم شمولیت کو حیران کن قرار دے کر اور حیربیار مری کو تحریک کیلئے نقصاندہ قرار دینے کا جو موقف ڈاکٹر اللہ نذر اپنا چکے ہیں۔(دیکھو سردار نہیں تو ہم جیسے مڈل کلاس آئے) اس تناظر میں کریڈٹ لینے کے عوامل واضح ہیں لیکن ذمہ داری لینے کا کوئی ایک موقف سامنے نہیں آیا۔قومی تحریکوں میں جو رضاکاریت کی حامل ہوتی ہیں یہاں ہر عمل اور ہر حیثیت محض ذمہ داری لینے کی بابت ہوتا ہے جبکہ ڈاکٹر نذر بی ایل ایف کی قیادت کی اپنی پہچان کا ایک انٹرویو میں برملا اظہار کرتے ہیں چنانچہ قیادت قبولنے کے ساتھ ذمہ داریوں کا اعادہ اور ان سے بری الذمہ ہونے کا جو رسمی اظہار ہوتا ہے اس سے بڑھ کر قومی تحریکوں میں عملی مظاہرہ ناگزیر ہوتا ہے۔عام طور پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں قیادت یا پارلیمانی ذمہ داریاں سنبھالنے کیلئے رسمی طور پر حلف کی رسم ادا کی جاتی ہے جو آئینی ذمہ داری بھی ہوتی ہے لیکن یہاں ہمارے ہاں اس حلف برداری کو محض رسم ہی سمجھا جاتا ہے چنانچہ اس کو عملی طور پر پرکھا جا سکتا ہے کہ اس ذمہ داری سے وہ کیسے عہدبرآں

داری لینا ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی اس کے لئے سپریم کونسل کے اجلاس،اجلاس میں بحث ومباحثہ ووٹنگ سمیت تمام رسومات کی ادائیگی کا ذکر عوامی سطح پر ضروری تھا (طالبان شریعت پر یقین رکھتے ہوئے ووٹنگ یا جمہوری طریقہ سے قیادت کے چننے کے اور اس کا عوامی سطح پر اظہار کے قطعی پابند نہیں لیکن حکیم اللہ محسود کے امریکی ڈرون میں مارے جانے کے بعد کئی دن تک شوریٰ کے اجلاس کی تحریک کے ترجمان کی توسط سے اطلاعات کی عوامی سطح پر فراہمی سمیت ملا فضل اللہ کے بطور امیر انتخاب سے متعلق اختلافات تک کی خبریں سامنے آتی رہیں، ملا فضل اللہ پر اتفاق کرنے یا نہ کرنے کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی ذکر روز میڈیا میں ہوتا رہا اور یہ بھی کہ شوریٰ کا اجلاس کئی روز تک جاری رہا' خالد خراسانی' عصمت شاہین اور ملا فضل اللہ میں کانٹے کے مقابلے کی روداد اور ان کی شوریٰ میں حمایت اور مخالفت کی باتیں اور وجوہات بھی عام کی گئیں۔بالآخر ملا فضل اللہ پر اتفاق ہوا چنانچہ تحریک طالبان اور بی ایل ایف کے قیادت کے انتخاب کے مراحل کا جائزہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جمہوریت سیکولر اور سوشلزم کے اصولوں پر کاربند رہنے والی بی ایل ایف کا اپنی قیادت کے انتخاب کے طریقہ کار کو لے کر کسی کو تحریک کا دشمن قرار دینے کے طریقہ کار میں بڑے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جہاں بی ایل ایف کے ہاں ایک فرد حیربیار کو جسے بی ایل ایف بغیر پارٹی بغیر پلیٹ فارم سمجھتی ہے اس کو دشمن قرار دینے کیلئے باقاعدہ طور پر تنظیم کے سپریم کونسل کا اجلاس منعقد کرتی ہے سپریم کونسل کے ارکان کو بلوچستان بھر سے یکجا کرنا

اور ون پوائنٹ ایجنڈے پر فیصلہ لینا دوسری طرف قیادت سمیت سیاسی انتظامی اور عوامی سطح کے بحرانات پر محض ترجمان کے بیان سے کام لینے کے فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جبکہ حیربیار مری کو فرد سمجھ کر کیونکر سپریم کونسل کے اجلاس کی ضرورت پیش آئی۔ حکمت عملی کے طور پر ہی سہی بی ایل ایف کی قیادت سے متعلق بھی عوامی آگاہی ضروری تھی۔ مسلح جدوجہد میں بھی بہرصورت جمہوری روایات کو عملی جامعہ پہنایا جا سکتا ہے جس طرح حیربیار مری کے معاملے میں سپریم کونسل کے اجلاس کو بلا کر تنظیم کے اندر جمہوری رویے کو مبینہ طور پر اپنایا گیا عوام تک فیصلے کے اعلان کو بھی رسمی لوازمات کیساتھ پہنچانے کو ضروری سمجھا گیا' قیادت سے متعلق نہیں بتایا گیا، ووٹنگ ہوئی یا نہیں؟ سپریم کونسل کے ارکان کے اتفاق رائے سے قیادت کا انتخاب عمل میں لایا گیا؟ اگر ووٹنگ ہوئی تو کن کن کے درمیان (طالبان کے ہاں امیر کے انتخاب کیلئے تین ناموں پر غور کیا گیا تینوں ناموں کے پس منظر تک کو تفصیل سے بیان کیا گیا)؟ ڈاکٹر اللہ نذر کھل کر اپنے نام کیساتھ مسلح جدوجہد سے منسوب ہیں جبکہ ممکنہ طور پر بی ایل ایف قیادت کی حامل دیگر شخصیات کا بھی عوامی سطح پر اعلان سے نہیں ہچکچاتی ہوگی (واحد قمبر بھی مسلح جہدکاری کی کھلم کھلا پہچان رکھتے ہیں) لہٰذا قیادت سے متعلق ان عوامل کو سامنے لانا ناگزیر ہوتا ہے۔ (بی آر پی کے آخری کونسل سیشن کے مبینہ طور پر کراچی میں انعقاد کو لے کر قیادت کے انتخاب اور قیادت کو باقی عہدیداروں کے انتخاب کا اختیار دیا جانا بھی ریکارڈ پر ہے جہاں ایک ہی پریس ریلیز میں تمام امور نمٹا کر کارکنوں کا کام آسان کردیا گیا) چنانچہ پریس ریلیز سے لے کر سپریم کونسل کے اجلاس کے فیصلوں میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے یہاں کریڈٹ اور ذمہ داری لینے جیسے دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ حیربیار مری کے معاملے میں بی ایل ایف کا بیان سپریم کونسل کا اجلاس بتاریخ سمیت عوامی سطح پر سامنے آتا ہے اس سے یہ مقصود کہ حیربیار مری کے خلاف بیان کا ذمہ دار ایک شخص نہیں پوری تنظیم (سپریم کونسل) ہے جبکہ اسی تنظیم کے لئے حیربیار مری کے خلاف بیان سے زیادہ اہم قیادت کے چناؤ کیلئے کسی بھی سپریم کونسل کے کا حوالہ یا الگ سے پریس ریلیز دینے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی' قائدا اپنے انٹرویو میں بطور قائد عوامی سطح پر اعلان کرنے پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔ یہاں بوجھ اور ذمہ داری کو لے کر دونوں معاملات کو پرکھا جائے تو بی ایل ایف نے حیربیار مری کو دشمن قرار دینے میں زیادہ بوجھ اور ذمہ داری محسوس کی جہاں تنظیم کے سپریم کونسل کے اجلاس کا تاریخ سمیت عوامی سطح پر اعلان کیا گیا جبکہ دوسری جانب تنظیم کی قیادت سے متعلق کوئی بنیادی ذمہ داری اور بوجھ کو محسوس نہ کرتے ہوئے اس کا عوامی سطح پر رسما بھی اعلان کو مناسب نہ سمجھا گیا۔ حیربیار مری کو دشمن قرار دینے کی جلدبازی کے پس منظر میں یہ عیاری بھی پنہاں تھی جہاں یکم مارچ کو پیش کئے گئے چارٹر پر بی ایل ایف اور اس کے قائد ڈاکٹر نذر کو موقف دینے پر دباؤ کا سامنا تھا جو اہم ذمہ داری تھی جبکہ بی ایل ایف کے ہاں ذمہ داری لینے کی کوئی روایت موجود نہیں۔ چنانچہ بلوچستان لبریشن چارٹر پر ڈاکٹر نذر اپنے اس موقف کہ حیربیار صاحب نے اچھا اقدام کیا ہے سب کو اس کی حمایت کرنی چاہئے،، کا اعادہ کرنا پڑتا جہاں اس بیان سے بی ایل ایف نے بلوچ اتحاد کے حساس بنائے گئے معاملے کو استعمال کرتے ہوئے حیربیار کو دشمن قرار دیا اب ایک شخص دشمن قرار پاتا ہو تو ان کی کاوشوں پر کیونکر تبصرہ یا رائے دی جا سکتی ہے۔ کریڈٹ اور ذمہ داری کے حوالے سے بی ایل ایف کے ان دو معاملات میں واضح تفریق چھپائے نہیں چھپ رہے۔ اوپر حلف کے رسم کی بات کی گئی جس کو ہمارے معاشرے میں رسم سے آگے کوئی حیثیت نہیں دی جاتی یہ محض جمہوریت کی نقالی کیلئے ہوتی ہے لیکن چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بات حلف کے لینے یا نہ لینے یا کسی شخص کا بطور قیادت فیصلوں میں مشاورت لینے یا نہ لینے کا معاملہ بھی آ سکتا ہے اور یہ معاملہ ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان میں مشرف کے معاملے میں دیکھا جا رہا ہے۔ تین نومبر کی ایمرجنسی، بطور صدر حلف کی عدم پاسداری کے معاملے میں مشرف پھنس رہے ہیں۔ ایمرجنسی کے معاملے میں مشرف کے تمام ساتھی یہ یہ کہہ چکے کہ ان سے کوئی مشاورت نہیں کی گئی۔ اور یہ منطقی امر بھی ہے کیونکہ جنرل مشرف کی آمریت کے عروج پر کسی گورنر سے مشاورت کی کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی چنانچہ ایمرجنسی کے ٹی وی پر آکر رسمی اعلان آج مشرف کیلئے ایک اہم ثبوت کے طور پر موجود ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ امر سامنے آتا ہے وہ یہ کہ بی ایل ایف کے ہاں حیربیار کو "دشمن" قرار دینے سے متعلق تو جمہوری نقالی کے طور پر سپریم کونسل کے اجلاس کے انعقاد کا شوشہ کیا گیا دوسری جانب گزشتہ سال سے مکران میں بی ایل ایف کی بی آر اے اور لشکر بلوچستان کیساتھ اتحاد سے ایک قدم آگے جہاں مشترکہ کارروائیوں کی بھی حکمت عملی بنائی گئی ہے جو حیربیار کو "دشمن" قرار دینے کے مقابلے میں یقیناً دیگر بلوچ "دوست" بنانے کے معاملات کو برابر اہمیت دی جا سکتی ہے اور اگر دشمنی کے مقابلے میں دوستی کا موازنہ کیا جائے تو عوام کیلئے کسی کو دشمن قرار دینے سے زیادہ کسی کو دوست قرار دینا زیادہ خوشگوار احساس کے طور پر لیا جا سکتا ہے اور بالخصوص عوام کے سامنے کسی بلوچ کو دشمن قرار دینا زیادہ اذیت ناک' ناگزیر اور ناپسندیدہ عمل قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے برعکس نئے دوست بنانے یا اتحاد کی جانب پیشرفت کا عوامی سطح پر اظہار زیادہ دلچسپ اور عوامی حمایت کا سبب بن سکتا ہے لیکن یہاں یہ فرق بھی بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ حیربیار کو دشمن قرار دینے کیلئے بی ایل ایف نے باقاعدہ طور پر سپریم کونسل کا ون پوائنٹ ایجنڈا پر مشتمل اجلاس بلایا اور حیربیار کو بی ایل ایف نے دشمن قرار دے کر اس کا اظہار عوامی سطح پر ناگزیر سمجھا گیا جبکہ دوسری جانب بی آر اے اور لشکر بلوچستان کیساتھ اتحاد کو کیونکر سپریم کونسل کی منظوری یا اس جانب پیشرفت سے متعلق سپریم کونسل کے اجلاس میں غور اور اس غور و خوض کے حامل اجلاس کا عوامی سطح پر میڈیا میں اعلان نہیں کیا گیا۔ انہوں نے اس کے برعکس حیربیار مری کو دشمن قرار دینے کے سپریم کونسل کے فیصلے کا میڈیا کی سطح پر اعلان کے مضمرات کی بھی پرواہ نہیں کی اور

ریاست کو بھی یہ پیغام دیا گیا کہ بی ایل ایف حیربیار سمیت کسی بھی بلوچ جہد کار کو نہ صرف دشمن قرار دے سکتی ہے بلکہ بعض کو غیر مسلح بھی کر سکتی ہے۔ غیر مسلح کرنے کی بھی شروعات اور اس کا عوامی سطح پر اعلان بی ایل ایف کی جانب سے ہی کیا گیا۔

اگلی پیشرفتوں سے متعلق اہم معاملہ جد وجہد کے معاملات پر بحث ومباحثے کا ہے جس کے لئے بی ایل ایف ہمیشہ پس وپیش سے کام لیتی رہی ہے۔ حیربیار مری کو دشمن قرار دینے کا اعلان بھی اس بحث ومباحثہ کو ناپسند کرنا ہی ہے جہاں حیربیار مری اور بی ایل اے کے فکری حلقے بحث ومباحثے کو جنم دینے کی شروعات کر چکے ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ بی ایل ایف نے اس بحث کو اس لئے ناپسند قرار دیا چونکہ اس سے دشمن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، معاملات مل بیٹھ کر حل کرنے کی تجویز دی گئی بعد ازاں بی این ایم کے حمل حیدر نے اس بحث کو فیس بک پر ان بکس پر منتقل کرنے کی بھی تجویز دی۔ یہ عمومی خدشات تھے جن کا بی ایل ایف اظہار کرتی رہی چنانچہ اس کا واحد حل بی ایل ایف کے پاس یہ ہوتا کہ وہ ان معاملات کو حل کرنے کیلئے سنجیدہ ہوتی یا کوئی اور حل تجویز کرتی لیکن بعد ازاں بی ایل ایف نے حیربیار مری کو ہی دشمن قرار دے کر اس بحث ومباحثہ کو سبوتاژ کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ اس سے بی ایل ایف یہ چاہتی ہوگی کہ چونکہ حیربیار مری یا ان کے فکری ساتھی اس بحث کو اپنی ذات سے الگ ہو کر پرکھتے ہیں تو جہاں ان پر بات آئے گی تو وہ اس بحث سے از خود بیزار ہونگے چنانچہ بی ایل ایف نے یہاں ایسا رویہ اپنایا جہاں انہوں نے زبان بندی کیلئے سیاسی بلیک میلنگ سے کام لیا جہاں ایک فریق اگر اپنی بات پر زیادہ زور دے تو دوسرا اس کی رازوں کا پردہ فاش کرنے کی دھمکی دے تو یہ دھمکی اکثر اوقات کارگر ثابت ہوتی ہے جہاں زبان بندیاں آسان ہو جاتی ہیں، ورنہ اس سے ہٹ کر بی ایل ایف کے اس سپریم کونسل (؟) بیان کے اور مقاصد کچھ بھی نہیں ہو سکتے۔ اب چونکہ اس بیان کے بعد بھی بحث ومباحثہ مدھم نہ ہوئی اور بی ایل ایف کے اس بیان کو پذیرائی کی بجائے تشویشناک قرار دیا جا رہا ہے تو بی ایل ایف نے سراسیمگی میں حیربیار مری سے کچھ آگے جا کر بی ایل اے کے ترجمان اور تنظیم کے اندر گروہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

بی ایل اے دیگر تنظیموں کی نسبت تنظیم بننے اور تنظیم کے اندر مشکلات ومسائل کے مراحل سے گزر چکی ہے اور بعض مسائل سے متعلق گزر رہی ہے چنانچہ ٹوٹنے کے عمل سے لے کر انتظامی اور معاشی مسائل تک کی مشکلات سے گزرتی رہی۔ ہتھیاروں پر قبضے کو بھی برداشت کیا جبکہ ان مشکلات کے دوران جن جن نقصانات کا بی ایل اے کو سامنا رہا ان مشکلات کا فائدہ ریاست کی بجائے دیگر تنظیموں کو ہوا جن میں یقینی طور پر یو بی اے بی ایل ایف اور بی آر اے منافع خور رہے۔ بی ایل اے کے بحث ومباحثہ کے آغاز سے قبل یہ روایت عام تھی جہاں تمام تنظیموں بالخصوص بی ایل اے کے حوالے سے نواب خیر بخش مری کی شخصیت کو اولیت حاصل رہی اور نظریات کے پرچار میں نواب مری کی شخصیت نمایاں رہی لیکن جوں جوں بحث ومباحثہ سے قلعیاں کھلتی رہیں تو یہ ثابت ہوا کہ بی ایل اے کی ان مشکلات میں نواب مری بھی حصہ دار رہیں۔ ان کی حصہ داری بی ایل اے سے علیحدگی اختیار کرنے والے یو بی اے کی ہر طرح سے حمایت کی صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ ان کی حمایت سے بی ایل اے کو نہ صرف یو بی اے کی علیحدگی سے متعلق نقصان ہوا بلکہ اصل نقصان انتظامی طور پر ناکہ بندی کی صورت میں ہوا جہاں سب سے اہم ہتھیاروں پر قبضے سے ہوا۔ بی ایل ایف کا ایک ساتھی ثناء عیدوا لگ ہوئے بی ایل ایف نے بانگ دہل کہا کہ اسے کوئی تنظیم قبول نہ کرے یہ زیر تفتیش ہیں چنانچہ اس امر کو لے کر بی ایل اے سے الگ یو بی اے کی تشکیل اور "ادھر تم ادھر ہم" جیسی پالیسی اختیار کرنے پر بی ایل ایف کیونکر یہ اصول وضع کرنے کیلئے سامنے نہیں آئی؟ یہاں پھر ذمہ داری اور کریڈٹ لینے کے معاملات میں دہرا معیار سامنے آتا ہے، ذمہ داری لینے کو کوئی تیار نہیں، آج بی ایل اے کی مشکلات کم ہوئی یا نہیں البتہ بی ایل اے نے ان مشکلات سے نمٹنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے اس سے قطع نظر بی ایل اے کی جانب سے ان مشکلات میں ڈھلنے اور جھنجھنے کی بجائے صف بندی، نظریاتی رشتوں کا از سر نو جائزہ سمیت انتظامی معاملات میں ایک نئے جوش کیساتھ کام کرنے کو سراہا جا سکتا ہے۔ ان تمام معاملات میں ایک یکسوئی نظر آتی ہے اور تسلسل کیساتھ جنگی حکمت عملی میں جدت لانے کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ چنانچہ گزری مشکلات میں جو منافع دیگر تنظیموں نے حاصل کیا اب وہ سیاسی منطق کے طور پر انہیں سود سمیت واپس کرنا پڑ رہا ہے۔ یقیناً یہ آخری اور طے شدہ امر کے طور پر نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اسے عروج وزوال کا منسوب کیا جا سکتا ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی عمل کے ردعمل کو ذہن میں رکھ کر اس کو پرکھا جائے تو نتائج وہی آتے ہیں جو منطق کے کہتی ہے۔

دشمن کے تعین سے لے کر دوست کے تعین اور ان سے میل ملاپ کیلئے ذمہ داری کا مظاہرہ ضروری ہے۔ جبکہ بلوچ کے ہاں دشمن اور دوست کے تعین میں کریڈٹ کو اولیت دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔

زاہد بلوچ کے اغواء کیسے ہوا اور اس میں ساتھیوں کی نادانی کس حد تک تھی اس سے قطع نظر بعد کی صورتحال میں بی ایس او آزاد کا رویہ قابل غور رہا ہے۔ تنظیمیں ایسی موقعوں پر ہی تنظیم ثابت ہوتی ہیں جبکہ ہمارے ہاں تنظیمیں ایسے موقعوں پر ایک اہم غلطی کے طور پر حقیقت پسندی سے گریز کرتی ہیں۔ ایسا ممکنہ طور پر تنظیمی ساکھ کیلئے کی جاتی ہے حالانکہ ساکھ مفاداتی تنظیموں کے ہاں زیادہ اہم ہو سکتا ہے جہاں ووٹ الیکشن اور مفاداتی سیاست کا عمل سامنے ہوتا ہے جبکہ ایسی تنظیمیں جو ایسے مفادات کے

برخلاف محض رضا کاریت کے تحت جد وجہد کرتی ہیں ان کے ہاں ساکھ کی مجبوریاں کیسے؟ جبکہ بی ایس او آزاد نے ایک ماہ تک اغواء کے واقعہ کو چھپایا بعدازاں ساکھ بچانے کیلئے حساس بنائے گئے ایک بلوچ فرزند کی جان کو خطرے میں ڈالنے پر اکتفاء کیا (سکول کے زمانے میں مداری مدعو ہوتے تھے تو وہ اپنے ساتھی کی جان خطرے میں ڈال کر تماشبیوں سے داد وصول کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے تو بچے سہم جاتے

میں الگ کیمپ ریکارڈ پر ہے جہاں سینکڑوں دن کیمپ لگانے کے بعد حقیقت پسندی سے کام لے کر کیمپ کو ماما قدیر کے کیمپ کے ساتھ ضم کیا گیا۔ البتہ اس ضمن میں اہم تجویز یہ دی گئی کہ اس معاملے کو انٹرنیشنل سطح پر اٹھایا جائے جہاں حمل حیدر اور شیر محمد بگٹی کی پارٹیاں بلوچستان کی بجائے لندن اور سوئٹزرلینڈ میں زیادہ فعال ہیں۔

ذمہ داری اور کریڈٹ لینے کے پہلوؤں پر غور کیا جائے تو بلوچستان لبریشن

بی ایل اے دیگر تنظیموں کی نسبت تنظیم بننے اور تنظیم کے اندر مشکلات و مسائل کے مراحل سے گزر چکی ہے اور بعض مسائل سے متعلق گزر رہی ہے چنانچہ ٹوٹنے کے عمل سے لے کر انتظامی اور معاشی مسائل تک کی مشکلات سے گزرتی رہی۔ ہتھیاروں پر قبضے کو بھی برداشت کیا جبکہ ان مشکلات کے دوران جن جن نقصانات کا بی ایل اے کو سامنا رہا ان مشکلات کا فائدہ ریاست کی بجائے دیگر تنظیموں کو ہوا جن میں یقینی طور پر یو بی اے بی ایل ایف اور بی آر اے منافع خور رہے۔

اور دل کھول کر داد دیتے اور مداری کی جادوگری بھول جاتے)۔ بی ایس او آزاد اور بی این پی کے آج کے رویوں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بی این پی مفاداتی سیاست کی حامل جماعت ہے جو اسمبلی میں موجود ہے، بلوچ ملازمین، بلوچ تعیناتیوں سمیت اختر مینگل اور حمل کلمتی کے فنڈز روکے جانے کی پریس ریلیز کی پہچان رکھتی ہے تو یہ اچھنبے کی بات نہیں، وہ بہر صورت ڈاکٹر عبدالمالک کی اپوزیشن ہے اور آج کی اپوزیشن کل کی حکومت، تو اس صورت میں بی این پی کی پریس ریلیز میں کرختگی دھمکائے جانے بلوچ کارڈ کے استعمال کے رویئے سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں دوسری جانب بی ایس او آزاد کا لطیفہ جوہر کے جسمانی وزن کو لے کر روز دو تین کلو کی کمی کی پریس ریلیز کسی صورت بی این پی کے دھمکے جانے کی پریس ریلیز سے مختلف نہیں جبکہ مقاصد ضرور مختلف ہیں، بلوچ تعیناتیاں، بلوچ ملازمین اور فنڈز کی بندش محض ہوائی باتیں ہیں جو محض توجہ کے حصول کیلئے ہیں، دوسری جانب زاہد بلوچ کی بازیابی مقصد ہے جو توجہ کی بجائے حصول یابی ہے، لیکن بازیابی کیسے؟ کس سے؟ یہ سوال بھی یہاں حصول یابی سے پہلے غور کرنے کے ہیں۔ چنانچہ زاہد بلوچ کے اغواء پر لندن میں تین روزہ حمل حیدر کی بھوک ہڑتال کے بےاثر ہونے پر کریمہ بلوچ کے کیمپ کے زیادہ سے زیادہ 40 یا 50 دن۔ بعدازاں وہ حقیقت پسندی کھل کر سامنے آئے گی جس کی ضرورت ایسے واقعات پر پہلے دن کا متقاضی ہوتی ہے وہ پارلیمانی سیاست کے رویئے کے طور پر پہلے دن نہیں کی جاتی۔ بعد میں جب حقیقت پسندی کی جائے گی تو ماما قدیر کے کیمپ پر ہی اکتفاء کیا جائے گا۔ ڈاکٹر مجید کی قابل احترام بہن گودی فرزانہ مجید کا شروع میں ماما قدیر کے کیمپ کے بغل

چارٹر اور حالیہ بحث جو حیربیار مری، بی ایل اے اور ساتھیوں کی جانب سے شروع کی گئی ہے وہ ذمہ داری کے رجحان کا آغاز ہیں۔ لبریشن چارٹر ایک عہد و پیمان ہے جو بلوچ قوم اور آزادی کی جد وجہد کرنے والوں کے درمیان ہے جو از خود ایک ذمہ داری کا تعین کرتا ہے جہاں پہلی دفعہ بلوچ قوم کی قربانیوں کو ان کے ساتھ ایک عہد و پیمان کیساتھ نتھی کر کے ایک تاریخی دستاویز کی شکل دی گئی۔ اس سے یقیناً بلوچ عوام اور آزادی کے جہدکاروں کے درمیان ایک اعتماد کی فضاء پیدا ہو گئی ہے اور یہ اعتماد کی فضاء ہر معاملے میں سب سے پہلے ذمہ داری لینے سے ہی پیدا ہوتی ہے چنانچہ لبریشن چارٹر جہدکاروں کو پچھلے ادوار کے مقابلے میں حتی الوسع ذمہ دار قرار دیتا ہے اسی طرح بلوچ قوم کو بھی چارٹر کی حمایت کے بدلے میں جد وجہد کے ساتھ جڑنے کی ترغیب دی گئی ہے جن کو مستقبل کے بلوچستان سے متعلق صاف صاف بتا دیا گیا ہے۔ یہ روڈ میپ ہم سب کو سب سے پہلے ذمہ دار بناتا ہے بجائے اس کے کہ دنیا کے نامور انقلابیوں کیلئے مشتمل القابات کو از خود اپنے لئے منتخب کریں۔ یہ رویئے ذمہ دار بننے کے نہیں غیر ذمہ داری کے رویئے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ رہنمائی ذمہ داری ہے اور ذمہ داری ہی سب سے بڑا کریڈٹ ہے جبکہ کریڈٹ بغیر ذمہ داری کے یقیناً کچھ نہیں۔

دشمن کے تعین سے لے کر دوست کے تعین اور ان سے میل ملاپ کیلئے ذمہ داری کا مظاہرہ ضروری ہے۔ جبکہ بلوچ کے ہاں دشمن اور دوست کے تعین میں کریڈٹ کو اولیت دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آزادی کا روڈ میپ

عرفان خلیل بلوچ

اگر ہم لفظ ''آزادی'' کا جائزہ لیں تو یہ منفی امن کے بجائے مثبت امن کی طرف اشارہ کرتا ہے، سماج کے اندر منظم تشدد ہر مظلوم و محکوم فرد و قوم کو استبدادی قوتوں کے خلاف باقاعدہ تشدد کے آغاز کرنے کیلئے اکساتا ہے لیکن آزادی کا حصول معقولیت، حقیقت پسندی اور تحلیل نفسی نظریات کے بنیاد پر ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ حصول آزادی کا مطلب استبدادی قوتوں کو مجبور کر کے اپنا آزادی منوانے کے بجائے حقیقت پسندی کے بنیاد پر اپنے معروضی حالات سے ہم آہنگ ایسے کثیر الجہتی پالیسیز مرتب کرنا ہے جو قابض سے چھٹکارے کی راہیں ہموار کرسکیں۔ یہاں مجھے کچھ واقعات، ہم آہنگ نظریات، مختلف سیاسی فلسفیوں کے افکار اور خاص طور پر لیڈر شپ کے خصائل پر ایک طائرانہ نظر دوڑانی پڑے گی تاکہ میں اپنے نقطہ کو مزید واضح انداز میں بیان کرسکوں۔ سیادت یا اجارہ داریت اس جدید دور میں قومی فلاحی ریاست کے قیام کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سیادت ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہمیں قبل از آزادی کے ان ادوار کی جھلک دکھاتا ہے جب مختلف طبقہ ہائے فکر سے منسلک افراد ایک منظم ڈھانچہ تشکیل دے کر اسے نظریات کی چاشنی بخش کر طاقت اور فیصلہ کرنے کے اختیارات ایک شخص کے ہاتھ میں دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسے ایک لیڈر کے لقب سے نوازتے ہیں۔ کسی بھی کامیاب انقلاب یا تحریک آزادی کیلئے لوگوں کو مقصد کے حوالے سے واضح طور پر آگاہ کرنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اگر وہ اس بات سے آگاہ رہیں گے کہ تحریک نا صرف قومی بلکہ ان کے طبقہ کے حوالے سے بھی ناگزیر اور فائدہ مند ہے تو پھر ان کی شرکت اور دلچسپی زیادہ مضبوط اور نظریاتی ہو جاتا ہے۔ وہ تحریک جہاں عام لوگ بنیادی نظریات سے آشنا نہیں تھے وہاں یا تو تحریکوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا یا پھر قلیل مدتی فائدے ہی ان کو میسر آسکے۔ جہاں تک بلوچ تحریک آزادی کا تعلق ہے ہمیں طویل المدتی اور قلیل المدتی پالیسیز سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا طویل المدتی پالیسی صرف بلوچستان کی آزادی ہے اور یہ ناگزیر ہے۔ بلوچ جہد آجوئی سے منسلک تمام جہد کار اس یک نقاطی پالیسی سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس پر کسی سمجھوتے پر راضی نہیں لیکن بد قسمتی سے ہم قلیل المدتی پالیسیز کے پیش نظر کبھی کسی روڈ میپ پر نا تو توجہ دیتے ہیں اور نا ہی متفق نظر آتے ہیں حالانکہ روڈ میپ ہی وہ چیز ہے جو نا صرف بلوچ کو من حیث القوم آزادی سے کامیابی کے ساتھ ہمکنار کرسکتا ہے بلکہ یہ شخصیت کے بجائے نظریات سے ہمیں جوڑ کر بعد از آزادی ایک حقیقی جمہوری فلاحی ریاست کا قیام ممکن بنا سکتا ہے۔ بلوچ تحریک آزادی کا دائرہ کار صرف پاکستان سے نجات تک محیط نہیں بلکہ آزادی کے فوراً بعد سے ہی ایک فلاحی ریاست کے قیام کی بار بھی اس کے کندھوں پر ہی ہوگی۔ ہم یقیناً تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کیوبا، ویتنام، شام، مصر، چائنا اور یوگوسلاویہ کی طرح نہیں بننا چاہیں گے جو آزادی سے پہلے شخصیت پرستی کا شکار ہو گئے تھے اور بعد از آزادی ان کے وہی ہیروز اور لیڈرز شام کے سادات اور مصر کے جمال ناصر کی طرح ان پر آمروں کی طرح مسلط ہو گئے، اس میں کوئی شک نہیں ایسے لیڈر قربانیاں دیتے ہیں لیکن یہ قربانیاں انہیں کبھی آمریت کا جواز نہیں بخش سکتے کیونکہ ایسی قربانیاں قوم کے دوسرے ہزاروں گمنام شہیدوں نے بھی دیا ہوتا ہے۔ ہمیں قبل از آزادی ہی ایسے پالیسیز وضع کرنے چاہئے جو بعد از آزادی جمہوریت اور طاقت کا منبع عوام کے ہاتھوں سونپنے کے مجاز ہونا کہ پالیسیوں کا محور شخصیتوں کو بنا کر آمریت کی راہ کو ہموار کیا جائے۔ جمہوریت تو تیسری دنیا کے کئی ممالک میں پائی جاتی ہے لیکن یہ زیادہ تر ناکام نظر آتے ہیں کیونکہ وہاں لوگوں کو کبھی ووٹ کے صحیح استعمال کی اجازت نہیں ہوتی وہاں ووٹ کسی لیڈر یا شخصیت کو دیکھ کر ڈالی جاتی ہے جبکہ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک پر ایک نظر دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ووٹ ڈالنے کی بنیاد ہمیشہ نظریات یا کچھ مسائل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں لیڈر اور عوام کے بیچ طاقت کا اتنا بڑا خلیج نہیں ہوتا۔ وہاں سماجی انصاف اور برابری

> **آج مکران میں آئے روز کے ہڑتالوں نے لوگوں کو معاشی طور پر تباہ کیا ہوا ہے اور بغیر ثبوت بی ایل ایف کا عام لوگوں کو مخبر قرار دیکر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو ممکن بنا رہے ہیں ایسے پالیسیاں صرف طاقت کے ہوس میں مرتب ہوتی ہیں اور آج ان کے ہی وجہ سے لوگوں میں روز افزوں بے چینی پھیلتی جا رہی**

کا ضامن عوام ہوتا ہے نا کے کچھ اجارہ دار لیڈر ۔ اگر ہم برطانیہ کے خلاف مصر کی تحریک آزادی پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ آزادی کے بعد مصر کا شمار تیسری دنیا کے مما لک میں ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں آزادی کے بعد طاقت کا ارتکاز عوام کے بجائے دو شخصیتوں جمال ناصر اور جنرل نجیب کی ذات بنی ۔ان دونوں نے برطانیہ اور اس کے باجگوار کٹھ پتلی حکمرانوں کے خلاف تحریک آزادی میں بڑا کردار ادا کیا لیکن لوگوں میں آگاہی کی کمی کی وجہ سے آزادی کے بعد مصر آمریت کا نظر ہو کر تیسری دنیا میں شمار ایک ملک بن گیا ۔اسی طرح شام میں بھی سادات اسد (بشار الاسد کے والد) ایک لیڈر بن کر ابھرے کیونکہ لوگوں نے تمام اختیارات اسے

کوئی بھی لیڈر اپنی پوری زندگی آزادی، انقلاب، مظلوم و محکوم لوگوں کے حقوق کیلئے وقف کر دیتا ہے لیکن ہم یہاں ان پالیسیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو کامیابی کے بعد روبہ عمل ہوتے ہیں ۔دوران جدوجہد ہو یا اس کے بعد کسی بھی لیڈر کو لوگوں کی معاونت کی سخت ضرورت ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو لیڈر لوگوں کے بدولت ہی کامیابیوں کو سمیٹنے کے قابل ہوتا ہے کیونکہ لوگ ہی اسے وہ طاقت مہیا کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کامیابی کے بعد لیڈر وہی طاقت لوگوں کے مفادات کے خلاف استعمال کرے ۔اگر بلوچ قومی تحریک آزادی کو دیکھا جائے تو لوگوں میں طویل المدتی پالیسی یعنی آزادی کے بابت آگاہی اپنے عروج پر ہے جس کی

ہمارا طویل المدتی پالیسی صرف بلوچستان کی آزادی ہے اور یہ ناگزیر ہے ۔بلوچ جہد آجوئی سے منسلک تمام جہد کار اس یک نقاطی پالیسی سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس پر کسی سمجھوتے پر راضی نہیں لیکن بدقسمتی سے ہم قلیل المدتی پالیسیز کے پیش نظر کبھی کسی روڈ میپ پر نا تو توجہ دیتے ہیں اور نا ہی متفق نظر آتے ہیں حالانکہ روڈ میپ ہی وہ چیز ہے جو نا صرف بلوچ کو من حیث القوم آزادی سے کامیابی کے ساتھ ہمکنار کرسکتا ہے بلکہ یہ شخصیت کے بجائے نظریات سے ہمیں جوڑ کر بعد از آزادی ایک حقیقی جمہوری فلاحی ریاست کا قیام ممکن بنا سکتا ہے

سونپ دیئے تھے اسی وجہ سے وہ نا صرف ایک ڈکٹیٹر بن کر سامنے آیا بلکہ اس کے بعد بھی طاقت عوام کے بجائے اس کے بیٹے بشار الاسد کے حصے میں آئی، جو ابھی تک شام کا سربراہ ہے ۔اسی طرح لوگوں کو جمہوریت اور نظریات کے بنیادی اصولوں سے نا آشنا رکھنے کا ایک اور مثال ہمیں جرمنی میں ہٹلر کی صورت میں ملتی ہے جہاں لوگ طاقت اور اختیارات کی اہمیت سے نابلد تھے اور ہٹلر کو لیڈر چن کر اپنے مستقبل کے آگے ایک رکاوٹ کھڑی کرنے کا مرتکب ہوئے ۔لوگوں کو سیاسی آگاہی سے دور رکھنے کی وجہ سے مستقبل میں ایک انتشار ابھر کر سامنے آ سکتا ہے جو یقیناً پچھتاوے اور غصے کے سوا کچھ بھی تخلیق کرنے کی اہل نہیں ہو سکتی ۔اگر کسی قومی ریاست کی بنیاد شخصیت پرستی اور ہیرو ازم کو بنایا گیا ہو تو پھر بعد میں یہی جا کر آمریت کو جنم دیتی ہے جس کا تسلسل بعد میں مزید اصلاحات اور انقلابات کا متقاضی ہوتا ہے اور امن کے بجائے ایک منفی تاثر ابھار کر انتشار کا ہی سبب بنتا ہے ۔اسی لیئے اگر عوام کو ابھی سے ہی آزادی اور شخصیت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے تو پھر مستقبل میں اس کا ثمر ایک پر امن جمہوری فلاحی ریاست کی صورت میں ہمارے سامنے آ سکتی ہے ۔یورپ پر اگر ہم ایک نظر دوڑائیں تو انگلینڈ، ڈنمارک، ناروے اور فرانس جیسے مما لک میں لیڈرز یا نمائندگان کا چناؤ نظریاتی اور موجود مسائل کی بنیاد پر ہوتا ہے نا کہ شخصیت پرستی اور اندھی تقلید پر جس کی وجہ سے وہاں لیڈر اور عوام کے بیچ طاقت کا توازن قائم رہتا ہے ۔ایک دانشور نے خوب کہا تھا کہ ”لیڈر اس درخت کے مانند ہوتا ہے جو اپنے لوگوں کو سایہ مہیا کرتا ہے نا کہ اپنے مفادات کیلئے لوگوں کے سر سے سایہ چھینتا ہے“ ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ

سب سے بڑی وجہ قابض پاکستان کا بلوچوں کے حوالے سے نسل کش پالیساں اور مادر وطن کی بے دریغ لوٹ مار ہے ۔اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ اس استحصال کی وجہ سے لوگوں میں شعور آزادی روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے اور قوم کے ہزاروں فرزندان ڈاکٹرز، دانشور، لکھاری، مزدور، کسان، اساتذہ اور جنگجوؤں کی صورت میں قربانی دیکر قوم کو کامیابی کے ڈگر پر رواں کرنے کا فریضہ سرانجام دے چکے ہیں اور ہزاروں ابھی تک برسر پیکار ہیں ۔ان قربانیوں کے بعد اب یہ امر ناگزیر ہو چکا ہے کہ بلوچستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد وطن کے صورت میں ابھرے ۔ان کامیابیوں کے بیچ میں ہی بلوچ قومی تحریک آزادی کو کچھ غلطیوں کا بھی سامنا ہے لیکن ان کوتاہیوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار تنقید ہے جو جو سیاسی و عسکری قیادت ایک دوسرے کے غلطیوں اور کوتاہیوں پر کر کے ان کی نشاندہی کر سکتے ہیں ۔لیکن تنقید کے جواب میں غیر منطقی اور تضحیک آمیز زبان استعمال کرنا بالکل بلاجواز ہے کیونکہ یہ نرگسیت کی پیداوار ہوتی ہے اور تنقید سے ان کے نرگسیت کو چوٹ پہنچتی ہے لیکن اگر مجموعی طور پر قومی مستقبل کے تناظر میں دیکھا جائے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نرگسیت کو چوٹ پہنچانا فائدہ مند ہے نقصاندہ نہیں ۔شخصیت پرستی اور انا دو ایسے عوامل ہیں جو ہمیں تنقید کے حوالے سے عدم برداشت کے رجحان کی طرف مائل کرتے ہیں ۔تنقید کے ذریعہ لیڈرز کا محاسبہ ہی عام لوگ، لیڈر اور تنظیم کے بیچ طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کا باعث بن سکتے ہیں ۔اگر لیڈرز آج تنقید جیسے میسر ہتھیار کو نظر انداز کریں گے تو پھر مستقبل میں ہمیں اس کا خمیازہ عرب ملکوں کے آمریت کی صورت میں بھگتنا

پڑے گا جو آزادی تو حاصل کر سکے لیکن صرف ایک طبقے کیلئے۔ وہ تمام ممالک جو کسی انقلاب یا تحریکِ آزادی سے گذر کر آج دنیا کے نقشے پر موجود ہیں اور کوئی نمایاں لیڈر رکھتے ہیں جیسے کیوبا میں کاسترو، یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو، ایران میں خمینی، مصر میں جمال ناصر اور اس کے بعد آمروں کا تسلسل، چین میں ماو 30 سال تک (دوسروں سے مختلف لیکن ماو کے بعد چین نے اصلاحات کے ذریعے کمیونزم کو مخلوط طرز معیشت سے بدل دیا)، اسٹالن کی لیڈرشپ جو لاکھوں روسیوں کو قتل کرکے روس کو ایک قید خانہ بنانے کا مرتکب ہوا، یوگوسلاویا کے ٹیٹو نے تیں ہزار لوگوں کو قتل کرکے اپنے آمریت کو قائم رکھنے کے نظر کر دیا جس کی سب سے بڑی وجہ روس کی اثر انگیزی نہیں بلکہ ٹیٹو کا یہ خوف تھا کہ اسے اختیارات لوگوں کو منتقل نا کرنا پڑے۔ ہٹلر آیا تو جمہوری طریقے سے لیکن اختیارات ایک شخص کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے اس نے جرمنی کا مستقبل ہی قریباً چوپٹ کر دیا۔ یہ جدید دور ہے جس میں بلوچ تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے ہمیں سفارت، معقولیت اور منطق سے ہم آہنگ پالیسیز مرتب کرنے پڑیں گے نا کہ 1973 کی طرح کے کوئی بھی آ کر ہمیں اپنے مفادات کیلئے ایک اوزار کی طرح استعمال کرکے پھینک دے۔ یہ 2014 ہے اس میں ہمیں اپنے تحریک کو معقول سفارتی طریقوں سے ہم آہنگ کرکے آگے بڑھانا ہوگا، لوگوں کو جمہوریت اور فلاحی ریاست اور آزاد بلوچستان کے حوالے سے شعور و آگاہی سے لیس کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے دشمن کے آنکھوں میں دھول جھونکنا ہوگا نا کہ ان کے حکمت عملیوں اور نفسیاتی حربوں کا شکار ہونے کے۔ ان سب باتوں کے پس منظر میں جایا جائے تو یہ سب یو بی اے اور بی ایل ایف جیسی تنظیموں سے جا ملتی ہیں، جن کی لیڈرشپ کچھ ایسے حکمت عملیوں پر عمل پیرا ہیں جو اپنے ہی لوگوں کے خلاف جا رہے ہیں، جیسے کہ اپنی ذاتی رنجش کے بنیاد پر معصوم لوگوں کو غدار کا لقب دیکر بغیر ثبوت قتل کرنا، آئے دن مکران میں ہڑتالوں سے لوگوں کا معاشی قتل کرنا۔ کسی بھی انقلابی تحریک میں دوران وقوع توازن کے حوالے سے شعور و آگہی پھیلانا ہمارا قلیل المدتی پالیسی ہونی چاہئے کیونکہ تحریکوں میں ایسا ہوتا ہے کہ طاقت کے حصول کے بعد لوگ اسے اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کے حصول کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ آئے روز کے ہڑتالوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان تنظیموں اور ان سے منسلک شخصیات سے خوف پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی فوج سے محبت کے

اگر کسی قومی ریاست کی بنیاد شخصیت پرستی اور ہیرو وازم کو بنایا گیا ہو تو پھر بعد میں یہی جا کر آمریت کو جنم دیتی ہے جس کا تسلسل بعد میں مزید اصلاحات اور انقلابات کا متقاضی ہوتا ہے اور امن کے بجائے ایک منفی تاثر ابھار کر انتشار کا ہی سبب بنتا ہے۔ اسی لیئے اگر عوام کو ابھی سے ہی آزادی اور شخصیت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے تو پھر مستقبل میں اس کا ثمر ایک پرامن جمہوری فلاحی ریاست کی صورت میں ہمارے سامنے آسکتی ہے

بجائے ڈرنے لگے تو یہ اس فوج کی زوال کی علامت ہے، کسی تحریک کی بنیاد جب خوف پر رکھی جائے گی تو پھر بالآخر اس کا نتیجہ ہمارے سامنے آمریت کی صورت میں آتی ہے اور اگر جمہوریت کی بنیاد نظریات اور مسائل کے بجائے شخصیات کے بتوں پر سجائی جائے گی تو یہ بھی آمریت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ اگر سوچا جائے کہ آج ہمارے لیڈرشپ کے پاس جو طاقت ہے اس کا منبع ہم ہیں اور ہم نے ہی انہیں یہ طاقت دی ہے اور اگر کل کو وہ یہی طاقت اپنے اجارہ داریت اور شخصیت کو نکھارنے کیلئے استعمال کریں گے تو پھر ہمارا مستقبل بھی جمال ناصر کے مصر اور تیسری دنیا کے ممالک سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ شاید یہی وہ وجہ ہے کہ آزادی کے بعد زیادہ تر ممالک تیسری دنیا کے ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ بلوچستان لبریشن چارٹر کو پوری قوم میں تقسیم کیا گیا، اس کے تمام مندرجات بلوچ نفسیات اور عالمی حالات سے مکمل ہم آہنگ ہیں، لیکن پھر بھی اسے صرف اپنے ذاتی انا کی وجہ سے ہدف تنقید بنایا گیا، حالانکہ ہر ایک بلوچ کو پتہ ہے کہ اسے ہر بلوچ قوم پرست تنظیم کے سامنے برابری کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، یہ تنقید کی بدترین قسم تھی تنقید کبھی بھی ایسے سطحی اور ذاتی پسند و ناپسند کے بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے۔ آج کل ہم فیس بک پر مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ان مذکورہ تنظیموں پر تنقید ہو رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے بی ایل اے ہے جو مڈل کلاس کی نمائندگی کرنے والی تنظیم بی ایل ایف پر تنقید کرتی ہے، لیکن دیکھنے کی بات ہے کہ جنگ بی ایل اے کے کمانڈر کے حوالے سے کسی کو پتہ نہیں یہ عام لوگوں میں ایسے مدغم ہیں کہ کوئی عام بندہ ان کو نہیں جان پاتا لیکن دوسری طرف جیسے ہی ہمارے سامنے بی ایل ایف کا نام لیا جائے تو فوراً ہمارے ذہنوں میں ڈاکٹر اللہ نظر آجاتا ہے، اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون عام لوگوں کے برابر ہے اور ان میں مدغم ہے۔ آج مکران میں آئے روز کے ہڑتالوں نے لوگوں کو معاشی طور پر تباہ کیا ہوا ہے اور بغیر ثبوت بی ایل ایف کا عام لوگوں کو مخبر قرار دیکر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو ممکن بنا رہے ہیں ایسے پالیسیاں صرف طاقت کے ہوس میں مرتب ہوتی ہیں اور آج ان کے ہی وجہ سے لوگوں میں روزافزوں بے چینی پھیلتی جا رہی ہے۔ تنقید کے ذریعے سے ہم بلوچ عوام کو اس مستقبل سے آگاہ کر سکتے ہیں جو ہمارے عمل پیرا حکمت عملیوں کی وجہ سے ہمارا مستقبل بنے گا، یہ ہماری کمزوریوں پر روشنی ڈالتی ہے اور ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ کیا رکاوٹیں ہیں جو ہمیں مقصد کے حصول سے دور رکھے ہوئے ہیں اور تنقید ہی ہماری مدد کرتی ہے کہ ہم طویل المدتی اور قلیل المدتی پالیسیاں اپنے معروضی

حالات سے ہم آہنگ کر کے مرتب کریں۔ہم تعمیری تنقید سے اپنے کمزوریوں پر قابو پا سکتے ہیں اور آج سے ہی ایک آزاد جمہوری فلاحی ریاست کے رستے پر گامزن ہو سکتے ہیں، ہم اپنے قلیل المدتی اور طویل المدتی پالیسیز کو ہم آہنگ کر کے آزاد بلوچستان کیلئے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔آزادی فلاحی ریاستِ بلوچستان کے قیام کیلئے ہمیں ایسے سیاسی کارکنوں کی ضرورت ہے جو تنقید کو برداشت کر سکیں اور انا سے مبراہوں۔ایک فرد دوسرے کیلئے آئینہ ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہماری عکاس ہوتے ہیں وہ ہمارے ہر عمل و کردار کو ہم سے زیادہ پرکھ سکتے ہیں۔اسی طرح کوئی فرد ہو، ادارہ ہو یا کوئی ریاست وہ اپنے کمیوں سے آشنا ہونے کیلئے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ بلوچستان کے لوگ پاکستان کی طرح کا کوئی جعلی جمہوریت نہیں چاہتے جہاں جمہورت نواز شریف، بھٹو اور عمران خان جیسے شخصیتوں کا محتاج ہے اور اس میں عام لوگوں کیلئے کوئی جگہ نہیں۔آزاد بلوچستان میں مغربی ممالک کے طرز پر جمہوریت ہوگی جہاں ملک کے وزیر اعظم اور ایک عام شخص کے بیچ طاقت کا توازن قائم ہوگا اور سب برابر ہونگے۔بلوچستان کا وزیر اعظم اور ایک عام بلوچ کو یکساں سماجی انصاف اور برابری حاصل ہوگی، ان کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ ہم آج سے ہی عام بلوچوں میں شعور و آگہی پھیلائیں۔آزاد بلوچستان میں حقیقی جمہوریت ہوگی جہاں اقتدار اعلیٰ صرف عوام کے پاس ہوگا، جیسے کہ بجٹ عوام سے منظور ہو کر ہی نافذ العمل ہوگی اور یہی عوامل ہمیں مثبت امن کی طرف لیجائیں گے، جیسا کہ آج سویڈن، ناروے اور سویٹزرلینڈ جیسی مثالی ریاستیں ہیں جن کی بنیادی معاشی، سیاسی اور سماجی برابری پر پڑی ہے۔آزاد بلوچستان قبائلی، شخصیتی، لسانی، علاقائی، نسلی اور رنگی تفرقات سے پاک ہوگی۔اس کیلئے آج سے ہی ہماری لیڈروں اور عوام کو طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کیلئے شعور و آگاہی سے لیس ہونا پڑے گا۔ہمیں یہودیوں کے طرز پر جد و جہد کرنی پڑے گی جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد انہوں نے مصر کی طرح طاقت کو کچھ شخصیتوں میں مرتکز ہونے نہیں دیا جس کی وجہ سے آج اسرائیل ایک مثالی زرعی فلاحی ریاست ہے جہاں لوگ خود اپنے نمائیندے چنتے ہیں اور وہ بھی صرف نظریات اور موجودہ مسائل کو مدنظر رکھ کر۔

شخصیت پرستی اور انا دو ایسے عوامل ہیں جو ہمیں تنقید کے حوالے سے عدم برداشت کے رجحان کی طرف مائل کرتے ہیں۔تنقید کے ذریعہ لیڈرز کا محاسبہ ہی عام لوگ، لیڈر اور تنظیم کے بیچ طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کا باعث بن سکتے ہیں

افلاطون جمہوری نظام کے مخالفوں میں سے تھا کیونکہ اس نے سقراط کو زھر دینے والی جمہوریت کو اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا، ہم نہیں جانتے کہ اس کے دور میں کس طرح کی جمہوریت نافذ تھی لیکن ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ وہاں جمہوریت شخصیتوں پر انحصار کرتی تھی جس کی وجہ سے کچھ نااہل لوگ سربراہ بنے ہوئے تھے جیسا کہ آج کل تیسری دنیا کے ممالک میں ہے۔اس کے بعد مغرب نے تو خود کو بدل دیا لیکن آج وقت کی ضرورت ہے کہ ہم بھی خود کو بدلیں آج ہمیں اپنی جد و جہد نا صرف سیاسی تبدیلیوں بلکہ سماجی تبدیلیوں کیلئے بھی کرنی چاہیے ورنہ ایسا نا ہو کہ ہم صرف آقا بدلنے میں ہی کامیاب ہو جائیں یعنی کے "نئی بوتل اور پرانی شراب"۔ہمیں ایک ایسی آزاد ریاست کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے جہاں ہر فرد کیلئے انصاف، طاقت، اختیارات اور سماجی رتبہ برابر ہو۔

کر کے آزاد بلوچستان کیلئے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔آزادی فلاحی ریاستِ بلوچستان کے قیام کیلئے ہمیں ایسے سیاسی کارکنوں کی ضرورت ہے جو تنقید کو برداشت کر سکیں اور انا سے مبراہوں۔ایک فرد دوسرے کیلئے آئینہ ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہماری عکاس ہوتے ہیں وہ ہمارے ہر عمل و کردار کو ہم سے زیادہ پرکھ سکتے ہیں۔اسی طرح کوئی فرد ہو، ادارہ ہو یا کوئی ریاست وہ اپنے کمیوں سے آشنا ہونے کیلئے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔

"آج طاقت موجود ہے اس کو لوگوں کے بھلائی اور آزاد قومی ریاست کے تشکیل کیلئے استعمال کرنے کیلئے ضروری ہے ہے کہ ہم آج سے ہی سیاسی و سماجی تبدیلیاں لانے کیلئے طویل اور قلیل المدتی پالیسیاں تشکیل دیکر ان پر عمل پیرا ہو جائیں"

"یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جیسا بوو گے ویسا ہی کاٹو گے"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بلوچ قومی تحریک کا عروج وزوال

شبیر بلوچ

قو میں عروج وزوال سے گذرتے ہیں، زندہ قو میں اپنے زوال کے اسباب جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور جن غلطیوں کی وجہ سے وہ زوال کا شکار ہوئے، انہیں دہرانے کے بجائے ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، بقول ابن خلدون "عروج وزوال تمام اقوام پر آتے ہیں" تاریخ ہمیں عروج وزوال کے وجوہات بھی بتاتی ہے۔ ہر عروج کے بعد زوال آتا ہے، دوران عروج جب قوموں پر حکمرانی کرنے والے حاکم کی قانون اصولوں کے دائرے سے نکلتے ہوئے، غیر منصفانہ فیصلے، سفاکی، درندگی، طرفداری، عیش وعشرت، آزاد خیالی اور اپنے لوگوں سے خود کو الگ سمجھنے کا رجحان ریاست واقوام کی تباہی وبربادی اور زوال کا سبب بنتے ہیں۔ جبکہ زوال سے عروج کی طرف کا سفر اعتماد، ایمانداری، خلوص قوم ووطن کے ساتھ سچی وابستگی اور کمٹمنٹ اصول جس میں تعلق داری، رشتہ داری، ذاتی پسند وناپسند کے بجائے اصولوں کی اہمیت، اپنے مقصد پر ڈٹے رہنا مطمع نظر، منزل مقصود کے بجائے کسی اور چیز کو اہمیت نا دینا اور اس منزل کیلئے صحیح راستے کا چناؤ کرنا، راستے میں آئے رکاوٹوں کی وجہ سے راستہ تبدیل کرنا لیکن منزل مقصود کو نا چھوڑنا یہ عوامل قوموں کو زوال سے عروج کی طرف لیجا سکتے ہیں اور قو میں بدحالی بھوک افلاس غربت پسماندگی، بے تعلیمی جاہلیت سے نکل کر خوشحالی وترقی کے شاہراہ پر قدم جما سکتے ہیں۔ اسلئے پہلے سے متعین ٹارگٹ ومقصد دھندلا ہونے کے بجائے واضح ہو، اگر مطمع نظر واضح ہو تو اسے حاصل کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے، تب جا کر قو میں جدوجہد محنت قربانی سے اپنا وہ ٹارگٹ حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح نیدرلینڈ 1581 سے پہلے اسپین اور ہاسبرگ سلطنت کے زیر تسلط تھا اور ان کا اپنے ملک کا کوئی وجود نا تھا لیکن نیدرلینڈ کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے ملک کو الگ کریں گے اور آزاد ریاست کے طور پر اپنے ملک کے تقدیر کے مالک خود بنیں گے، انہوں نے ولیم آف اورنج کی قیادت میں قبضہ گیریت کے خلاف مزاحمت شروع کی، انہوں نے اپنی آزادی کی جنگ 1581 تک لڑی اور آزاد ریپبلک آف نیدرلینڈ بنانے میں کامیاب ہوئے اور بالآخر 1648 میں اپنی آزادی کو دنیا میں تسلیم کروایا اور نیدرلینڈ ایک آزاد مملکت کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ ولیم آف اورنج کا مقصد واضح تھا کمٹمنٹ مضبوط

جب لوگوں کی وابستگی جذباتی بنیاد پر ہوں تو لیڈرشپ جدوجہد کو غلط رخ یا سمت دینے والے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہوئے جدوجہد کا رخ تبدیل کرتے ہیں

تھا انہوں نے جنگ کے دوران مختلف ذرائع استعمال کیئے، پمفلٹ تقسیم کیئے اور جنگی نغموں اور گانوں سے لوگوں کے جذبات بھڑکائے اور اپنے پروگرام ومقصد پر ڈٹے رہ کر اپنے ملک کو آزاد کیا اور پھر وہی نیدرلینڈ خوشحال اور دنیا کی ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھرا کیونکہ ان کے پاس واضح روڈ میپ اور پروگرام تھا، اسی پر چلتے ہوئے وہ خوشحالی کے معراج تک پہنچے ، اسی طرح سوئٹزرلینڈ کی آزادی میں ان کے قوم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ غلامی سے آزادی حاصل کریں گے ان کے قومی لیجنڈ ولیم ٹیل جو برگنڈی سلطنت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا جنہوں نے مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کو آزاد کریں گے آزادی جور استبداد اور کدورت تختی کی عدم موجودگی کا نام ہے یعنی ایک ملک کی غلامی سے آزادی آدھا حل ہے اور باقی آدھا حل ایک محکم، پائیدار قیام پزیر پختہ order ہے جو تمام لوگوں کو یکساں مواقع اور حق فراہم کرتا ہو حقیقی اور مکمل آزادی برابری انصاف عدل کے ساتھ جوڑا ہوا ہے ایک کے بغیر دوسرا نامکمل ہے قومی آزادی اس وقت تک مکمل نہیں جب تک عام لوگوں کو یکساں مواقع، حق آزادی، اظہار خیال کی آزادی اور تمام لوگوں کی خوشحالی برابر نا ہوں کیونکہ آزادی کے بعد ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے کام کریں۔ یہ اصول تھے سویزرلینڈ کی جہد کے

سوئٹزرلینڈ نے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے روڈ میپ پر عمل کرتے ہوئے اپنے ملک کو ترقی دی اور لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرتے ہوئے خوشحال کیا۔ آج سوئٹزر لینڈ دنیا کی ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہے جبکے دوسرے اقوام جنھوں نے آدھی آزادی پر زور دیا long term مقاصد کو اہمیت نہیں دی آج وہ اقوام آزادی تو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ حکمران اپنے عوام پر عذاب سے کم نہیں ہیں بلکہ وہاں غربت، پسماندگی، ناخواندگی اور قتل وغارت گری کا راج ہے۔ جیسے برما، لیبیا، شمالی کوریا، سوڈان، ترکمانستان، ازبکستان وغیرہ ان ممالک نے آزادی حاصل کی ہے لیکن یہ آزادی آدھی تھی پختہ آرڈر اور نئی سوچ، خیال وفکر کو فروغ دینے سے روکنے کے عمل نے انھیں مذید غربت اور پسماندگی کی دلدل میں ڈال دیا۔ جبکہ نیدرلینڈ، امریکہ اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ جنھوں نے نئی سوچ، خیال وفکر کو فروغ دیتے ہوئے خوشحالی کی جانب گامزن ہوئے۔ آج اگر ہم بلوچ قوم کی عروج وزوال کا جائزہ

لیں تو بلوچ قوم کی اپنی ایک آزاد ریاست تھی جو میر ومیر وانی، عومر، بجار، نصیر خان نوری سے محراب خان تک پھر انگریز تک پھر انگریز کے بعد پاکستانی قبضہ تک اس دوران عروج کب آیا اور اسکے زوال کا سبب اگر سب ہی کا صحیح طریقہ سے تجزیہ کیا جاتا تو 1948، 1962 اور 1973 میں پاکستانی قبضہ کے خلاف جدوجہد میں ناکامی کا سامنا نہ ہوتا۔ اور آج اگر 1973 اور 1988 کے جدوجہد کا صحیح تجزیہ نہ کیا جائے اور جدوجہد میں سب کچھ حسب سابقہ حالت رہنے دیا جائے تو وہی غلطی اور ناکامی ہوگی جو 1948,1962,1973 اور 1988 میں ہوا۔ جدوجہد میں عروج کی وجہ کیا تھی اور زوال کیسے ہوا اور آج 10 سال تک جو بلوچ قومی جدوجہد عروج پر تھا اور اسے عروج سے زوال کی طرف لے جانے کے اسباب جاننا انتہائی ضروری ہے۔ جدوجہد عروج پر تھا لیکن قوم زوال پر تھی وجہ جاننا بے حد ضروری ہے۔ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ لوگ صحیح انداز میں نہیں سوچتے انکی فکری انداز واضح نہیں ہے اور انکی سوچ جذباتی ہے اگر آج ہم بلوچ قومی تحریک کی ناکامیابیوں کا ماضی اور حال کے تناظر میں دیکھیں اور جذباتی لگاؤ سے ہٹ کر فکری انداز میں سوچیں تو کمزوریاں واضح دکھائی دینگے، کمزوریوں اور کوتاہیوں سے نجات کا واحد حل صحیح اور واضح فکر ہے۔ بقول ایک دانشور کے کہ ’’جھوٹا خیال اطمینان بخش ہو سکتا ہے لیکن بالآخر وہ دکھ، درد اور تکالیف بڑھاتا ہے اسے قبول کئے رکھنے سے ہماری تحریک، ذات اور معاشرہ کو نقصان ہوگا‘‘۔ جھوٹا خیال منشیات سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ منشیات سے بھی سکون ملتا

سیاست کی طرح بڑی بڑی ریلیوں پر توجہ مرکوز کرتے رہے۔ جیسے کہ بلوچستان اسمبلی میں میں کسی کو وزیر اعلیٰ بنانا مقصد ہو۔ پارلیمانی طرز سیاست میں ہجوم، پارٹی بازی، نمود ونمائش اور شوشہ اسلیئے ہوتا ہے، تا کہ ایک مخصوص پارٹی کو زیادہ سے زیادہ ووٹ ملیں اور وہ کامیاب ہو۔ کیونکہ انکا مقصد ہی وزارت اور کرسی ہوتا ہے لیکن انقلابی پارٹی میں مقصد قومی آزادی ہوتا ہے قومی آزادی صرف ایک گروہ پارٹی یا علاقے کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے ہوتا ہے جس میں بی آر پی، بی این ایم، بی این ایف، بی ایس ایف، بی این ایم (جی ایم شہید)، بی ایس او وغیرہ سب کا مقصد قومی آزادی ہے تو پھر کیونکر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے یا ایک کے ممبر کو دوسرے سے الگ کرنے کے لیے دوڑ لگا ہوا ہے اور انقلابی فکری اور تبدیلی کی سیاست میں دغابازی کا سہارا لے رہے ہیں۔ کبھی بھی انقلابی سیاست میں جھوٹ فریب اور دھوکہ دہی سے مسائل کا حل نہیں ہوا کرتے۔ انقلابی لوگ ایسے چیزوں سے دور رہتے ہوئے جدوجہد کرتے ہیں۔ جبکہ بلوچ قومی جدوجہد میں جذباتی وابستگی بہت زیادہ رہا ہے اور ہر دور میں لیڈرشپ نے قومی جذبات اور قومی تحریک کو صحیح رخ دینے کے بجائے اپنی راہداری کے بجا آوری کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اور جدوجہد کو پارلیمانی سیاست سے پہاڑوں پھر پہاڑوں سے پارلیمانی سیاست کی طرف موڑ دیا۔ کسی بھی قوم اور فرد کے لیے جذبات کے اثرات سے محفوظ رہنا آسان نہیں ہے۔ جب لوگوں کی وابستگی جذباتی بنیاد پر ہوں تو لیڈرشپ جدوجہد کو غلط رخ یا سمت دینے والے حقائق

ایمانداری، خلوص، قوم و وطن کے ساتھ سچی وابستگی اور کمٹمنٹ اصول جس میں تعلق داری، رشتہ داری، ذاتی پسند و ناپسند کے بجائے اصولوں کی اہمیت، اپنے مقصد پر ڈٹے رہنا مطمع نظر، منزل مقصود کے بجائے کسی اور چیز کو اہمیت نا دینا اور اس منزل کیلئے صحیح راستے کا چناؤ کرنا، راستے میں آئے رکاوٹوں کی وجہ سے راستہ تبدیل کرنا لیکن منزل مقصود کو نا چھوڑنا یہ عوامل قوموں کو زوال سے عروج کی طرف لیجا سکتے ہیں

ہے تو کیا اس طرح سے منشیات کے استعمال کو جائز ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بلوچ قومی تحریک میں بھی ایک جھوٹا خیال تھا کہ تحریک صحیح ہے 1962,1973 اور 1988 میں یہی کہا گیا اور 1973 میں نواب خیر بخش مری، سردار عطاء اللہ مینگل، غوث بخش کے درمیان اختلافات شروع دن سے ہی تھے لیکن جھوٹے خیال سے معاملات چلاتے رہے لیکن بعد میں ہر ایک کا راستہ الگ ہوا اور تحریک کو بھی نقصان ہوا۔ آج بھی اسی جھوٹے خیال کو اطمینان بخشتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن اندرون خانہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ بی این ایف جیسا اتحاد پارٹی بازی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا کیونکہ سب اپنے مقصد کو بھول کر پارٹیوں کو اپنا مقصد بنا چکے تھے ہر پارٹی اپنی پارٹی کو اوپر چڑھانے کے لیے بیساکھی کے طور پر بی این ایف کو استعمال کرتا رہا۔ فکر وسوچ کو فروغ دینے کے بجائے پارلیمانی طرز

کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہوئے جدوجہد کا رخ تبدیل کرتے ہیں۔ بلوچ قومی تحریک کو ہی دیکھ لیں کہ 1948,1962,1973 اور 1988 میں لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے بلوچ قوم کو عروج سے پہلے زوال کا شکار کیا گیا۔ اب جب ماضی کی غلطیوں پر غور کرتے ہیں تو انھیں حال میں دہرانے کے بجائے انکا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے اب غلطیوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بقول ہائی ریچلس ’’وقت کے ساتھ جب خیالات بدلتے ہیں تو اکثر تعریفیں بھی انکے ساتھ بدل دی جاتی ہیں‘‘۔ کوپرنیکس کے نظریہ نے جب نظام شمسی کے بارے میں ہمارا سوچ بدل دیا تو لفظ سیارے کی از سر نو تعرف کی گئی 1900 میں نیوٹن کے قانون حرکت اور قانون کشش ثقل کو مکمل طور پر درست سمجھا جاتا تھا کیونکہ انکی تصدیق ہو چکی تھی اسکے باوجود 1905 میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت دیت نے اسے مزید بہتر کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو غوث بخش

بزنجو، عطااللہ مینگل، رازق بگٹی، کہور، اختر مینگل، ایوب جتک، خیر جان ایک زمانے میں قومی ہیرو سمجھے جاتے تھے ان پر جذباتی لگاؤ سے اندھا دھندا اعتماد کیا جاتا تھا جب خیال بدلے تو تعریفیں بھی بدل گئی۔ بعد میں یہ سب قومی سیاست سے پاکستانی سیاست کی طرف مائل ہوئے۔ آزادی کے چیمپئن سے بابائے مذاکرات اور پاکستانی مفادات کو تفظ دینے والے بن گئے یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہے گا جب تک مقصد سے ہٹ کر ہم گروہیت، پارٹی بازی، علاقیت اور شخصیت پرستی کے اثر سے نہیں نکلیں گے۔ اب اس بار جد وجہد میں لوگوں نے بہت زیادہ قربانیاں دی ہیں اور جد وجہد نے چھوٹی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں لیکن پھر درمیان میں سرمچاروں نے اپنے طاقت کو دشمن کے بجائے عام عوام پر استعمال شروع کیا مکران میں مخبری کے نام پر قتل، ٹھیکہ داروں کو نارگٹ، منشیات کے نام پر عام لوگوں کو مارا گیا کیونکہ ہوئیں لیویز جو پاکستان اور بلوچ جنگ میں غیر جانبدار تھے اور بلوچ قومی تحریک کے حمایتی بھی تھے انکو بلا وجہ نشانہ بنانا۔ عام لوگوں کو سرمچاروں کے نام پر دھمکی دینے کے عمل نے لوگوں کو جہد کاروں سے الگ کیا جبکہ قابض بھی چاہتا تھا کہ مچھلی کو پانی سے دور کریں اور دشمن کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ gw 4 ایک جنگی اصلاح ہے جو سیاسی اور جنگی تکمیل نچوڑ یا کہ جنگ کا روپ صورت وشکل ہے یہ اصلاح کوسوو میں بھی کامیاب ہوا بلوچ جہد میں یہ عمل 4 gw کی کھلم خلاف ورزی ہے لوگوں کو خوف کی وجہ سے خود سے دور کرنا 4 gw کی قومی آزادی کی جہد کے عین مطابق نہیں ہے 4gw کی تصور یا کہ طرز فکر میں انسر جنسی وہاں جڑ پکڑنا شروع کر سکتا ہے عروج پر ہوتا ہے جہاں انکو عوام کی مکمل مدد کمک حاصل ہو یہاں تو ہدف ہی عوام اور لوگوں کو بنا دیا گیا ہے شخصیت، پارٹیاں سارے مقصد بن گئے کسی پر سوال اٹھانا کفر بننے لگا۔ یہ تمام آج کی جدوجہد کی کم وبیش مسائل ہیں۔ اب یہ مسئلے کیسے حل ہونگے ماضی کی طرح اس بار جدوجہد کو نقصان سے بچانے کے لئے کوئی چیز ضروری ہے۔ سب سے پہلے مسئلے کا تعین ہونا ضروری ہے۔ مسئلے کی حقیقی نوعیت کو بخوبی سمجھا جائے کوئی بھی آدمی جب نشے کا عادی ہوتا ہے تو وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کہ نشے کا عادی ہے جب کوئی اسے کہے کہ وہ نشے کا عادی ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے کے بجائے غصہ میں آتا ہے الزام تراشی پر اتر آتا ہے۔ قوموں کا بھی یہ حال ہے پیچیدہ حالات قومی تحریک اور سیاسی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ آج بلوچ قومی تحریک میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور سیاسی مسائل کو کمزوریاں و کوتاہیاں مشکلات قومی تحریک میں ہیں انھیں تسلیم کرنے کے بجائے الزام تراشی، گالم گلوچ کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے حالانکہ قومی تحریک کو جو درپیش مسائل ہیں ان پر غور وفکر کرتے ہوئے انکا تجزیہ کیا جانا چاہیے تھا ان پر لکھنا چاہئے تھا تنقید برائے تعمیر کا عمل شروع کیا جانا چاہئے تھا جو ماضی کے بجائے آج ہو رہا ہے تنقید برائے تعمیر کی مثال ڈاکٹر کی طرح ہے جو مریض کو ان چیزوں سے روکتا ہے جو اس کے جسم وصحت کے لیے نقصان دہ ہوں اسے تنقید برائے تعمیر سے ترغیب وترتیب کے زریعے نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔ پارلیمانی سیاست دھوکہ بازی کی سیاست میں ہر چیز قوم اور لوگوں سے چھپایا جاتا ہے لیکن

انسر جنسی وہاں جڑ پکڑنا شروع کر سکتا ہے عروج پر ہوتا ہے جہاں انکو عوام کی مکمل مدد کمک حاصل ہو یہاں تو ہدف ہی عوام اور لوگوں کو بنا دیا گیا ہے شخصیت، پارٹیاں سارے مقصد بن گئے کسی پر سوال اٹھانا کفر بننے لگا۔ یہ تمام آج کی جدو جہد کی کم وبیش مسائل ہیں

انقلابی اور تبدیلی کی سیاست میں جھوٹ انتہائی خراب اور نقصان دہ ہے۔ بقول کانٹ، ”جھوٹ ہمیشہ خراب ہے جھوٹ ایک فرد کا اپنے فرض منصبی کے ساتھ خلل اندازی ہے“

جھوٹ کے بہت سے اقسام ہیں ان میں ایک حکمت عملی سے متعلق ہے جو قومی مفادات کی خاطر دوسرے ممالک یا کہ دشمن کو دھوکہ دینے کے لیئے بتایا جاتا ہے۔ دوسرا selfish جھوٹ ہے، یہ جھوٹ لیڈر قومی مفادات کے بجائے اپنے ذاتی مفادات اور گروہی مفادات اور ذاتی قد کاٹ اور شخصیت کو بچانے کے لے بولتے ہیں۔ تیسرا بین الاقوامی جھوٹ جو لیڈر اچھی حکمت عملی کے لیئے بولتے ہیں تا کہ اپنے ملک کو دوسرے دشمن ملک سے بچائیں یہاں بھی قومی مفادات کو مدنظر رکھ کر اس جھوٹ کو بولا جاتا ہے اسے Noble Lie یعنی عالی شان جھوٹ کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ 1941 میں امریکی صدر روزویلٹ نے اپنے قوم کے ساتھ جھوٹ بولا اور نازی جرمنی کے خلاف جنگ کے لیئے تیار کیا اسنے کہا کہ نازی تمام یورپ کو قبضہ کرلینا چاہتے ہیں اور انکو روکنا ضروری ہے۔ لیکن یہ جھوٹ اپنے قومی مفادات کے تحفظ دینے کے لیئے اسنے بولا۔ چوتھی جھوٹ strategic cover up ہے جھوٹ یہ جھوٹ لیڈر اپنی ناکامی چھپانے کے لیئے بولتے ہیں یا اپنے متنازعہ پالیسی چھپانے کے لیئے بولتے ہیں۔ ایک اور جھوٹ nationalist myth making ہے اس میں لیڈر تاریخ دان ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم ہمیشہ صحیح تھے اور ہمارے مخالف غلط تھے۔ آخری جھوٹ Ignoble cover up جھوٹ ہے یا کہ کم ظرف نا کارہ یا رزیل جھوٹ ہے جو لیڈر اپنے فاش غلطی بغیر پیش رفت اور نا کامیاب، نا مراد پالیسی کو چھپانے کے لیئے بولتا ہے، اسکا مقدم اور فراخ مقصد خود کو اور اپنے گروہ کو بچانا ہوتا ہے۔ یہ جھوٹ سماج اور ملک اور تحریک کو بہت زیادہ نقصان سے دوچار کر سکتا ہے اس جھوٹ سے ہمیشہ نالائق نا اہل لوگوں کو تحفظ دیا جاتا ہے ان تمام جھوٹوں میں صرف اور صرف قومی مفادات کو تحفظ دینے اور حکمت عملی والے جھوٹ کے علاوہ باقی سب جھوٹ

قومی سیاست پر تباہ کن اثرات مرتب کرتے ہیں۔انقلابی اورتبدیلی کی سیاست میں اپنے لوگوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولا جاتا ہے بلکہ جہدکار کردار کے حوالے سے اعلی نمونہ ہوتے ہیں۔آج بلوچ جہد میں ہر جگہ جھوٹ بولا جارہا ہے اور اتنا جھوٹ بولا جارہا ہے کہ اگر کوئی حقیقت بھی ہو اسے جھوٹ تصور کیا جاتا ہے۔جہدکاروں پر اعتبار کم ہوتا جارہا ہے رزیل جھوٹ بول کر نا اہل جہدکاروں کو بچایا جارہا ہے جو انقلابی سیاست کے نام پر جدوجہد کررہے ہیں اور قوم کے نام پر جدوجہد کررہے ہیں اپنے ذاتی اور گروہوئی مفادات کے لیئے پوری جدوجہد کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں انکو تحفظ دینے کے لیئے بھی تواتر کے ساتھ جھوٹ کا سہارا لیا جارہا ہے۔حالانکہ یہ جھوٹ ان جہدکاروں کے ساتھ ساتھ پوری تحریک کو نقصان سے دوچار کررہا ہے۔حکمت عملی اور عالی شان جھوٹ کو کم ظرف رزیل جھوٹ کیساتھ خلط ملط کردیا گیا ہے۔کمزوریوں کوتاہیوں کو ماننے کے بجائے جھوٹ کا سہارا لیکر اپنے ہی لوگوں کو دھوکہ دیا جارہا ہے۔ بلوچ تحریک میں ماضی میں قوم کے ساتھ سب کچھ چھپانے کی وجہ سے تحریک ٹہراو کا شکار ہوا۔لیڈرشپ نے قوم کے ساتھ کفر کیا اور آج بہت سے لوگ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ایک بار پھر کفر کی تبلیغ کررہے ہیں۔کہ وہ رزیل جھوٹ کا سہارا لیکر خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ سب کچھ صحیح ہے اور اندرون خانہ اختلافات ایک دوسرے کے خلاف کام کرنا اور قوم کے سامنے کہنا کہ سب کچھ صحیح ہے قوم کے ساتھ اس سے بڑا کفر اور کیا ہوسکتا ہے۔کافر کے بھی لغوی معنی چھپانے والا ہے اسلیئے رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپاتا ہے، کاشت کار کو بھی کافر کہا جاتا ہے کہ وہ غلے کو چھپاتا ہے۔رزیل جھوٹ کا سہارا لینے والے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو چھپاتے ہیں اسلیے جدوجہد کا تقاضہ ہے کہ اس کفر سے ہم کو نکلنا ہوگا اور اگر ہم قوم کے نام پر جدوجہد کررہے ہیں تو قوم کو اعتماد میں لیتے ہوئے انکے مستقبل کے بارے میں بتانا ہوگا کہ آنے والا بلوچستان سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ کی طرح ہوگا یا کیوبا، شمالی کوریا، سوڈان ترکمانستان، ازبکستان یا انگولا کی طرح ہوگا۔آدھی آزادی والی پالیسی بھی سوڈان والی ہے جبکہ مکمل آزادی خوشحالی اور ترقی یافتہ بلوچستان کے لیے ہے۔اب ہمیں پاکستانی سیاست کی طرح غداری و کفر کے فتوے دینے کے بجائے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے جذباتی پن سے نکلتے ہوئے عقلی، فکری اور شعوری حوالے سے اپنی جدوجہد میں موجود مسائل کمزوریوں کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انکے حل کے لیئے تجاویز دیتے ہوئے اسے صحیح انقلابی سمت دینا چاہئے تاکہ بلوچ قومی جدوجہد ناکامیابی اور آدھی آزادی کے بجائے مکمل آزادی کے لیئے ہو جہاں اظہار خیال کی آزادی ہو، برابری، انصاف، قانون کی بالادستی اور خوشحالی کا بول بالا ہو۔چیتا انسان سے تیز بھاگ سکتا ہے شیر انسان سے بہتر لڑ سکتا ہے ہاتھی مگرمچھ انسان سے زیادہ طاقتور ہے لیکن انسان کو ان تمام مخلوق پر واضح برتری حاصل ہے کہ انسان کے پاس دماغ کی صلاحیت ہے وہ سوچ سکتا ہے غور کرسکتا ہے اپنی دماغی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی بہتر رائے قائم کرسکتا ہے اندھی اتباع یا تعاقب کرنے سے نہیں بلکہ لوگ سوچ بچار سے شعوری رائے قائم کرتے ہوئے جدوجہد کا ہمگام بن جاتے ہیں اسکے لیئے اگر آج لکھنا اور تنقید برائے تعمیر پر قدغن ہوگی تو حامد میر جیسے واقعات بلوچستان میں بھی ہوسکتے ہیں اور سرمچار بےفکر نہ ہوں کہ ان پر کوئی تنقید نہیں کرسکتا کیونکہ وہ بارڈر پر قربانی دے رہے ہیں اب ان چیزوں سے نپٹنے کے لیئے آدھی آزادی کے بجائے سوئٹزرلینڈ کی طرح مکمل قومی آزادی کا روڈ میپ ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ بحث ومباحثہ اور تعمیری تنقید کا ماحول بلوچ قومی جہد کے لیئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔تنقید برائے تعمیر جو اصلاح کے لیئے ہو تحریک کو نقصان سے بچانے کے لیئے تنقید برائے تعمیر اور کردار کشی کے فرق کو بھی جاننا ضروری ہے۔تنقید کے معنی ہے کہ کسی کی غلطی کمزوری خامی کوتاہی پر اپنی نامنظوری، ناخوشی کا اظہار کرنا۔کسی کی ذات کو نارگٹ کرنا بھی تنقید کے زمرے میں نہیں آتا ہے بلکہ وہ ضد اور انا اور جہالت یا بگاڑ کے دائرے میں آتا ہے۔تنقید برائے تعمیر غلطی اور کمزوری جو جدوجہد کے دوران کسی لیڈر یا شخص سے سرزد ہوا سے بتلانا ظاہر کرنا نشاندہی کرنا ہوتا ہے۔اب بلوچ قومی تحریک میں موجود غلطیوں اور کمزوریوں کا ظاہر کرنا ضروری ہے لیکن اسکی آڑ میں کردار کشی، گالی گلوچ، عامیانہ سوقیانہ اور ابتذال سے خیال کا اظہار قطعاً قوم دوستی نہیں اور قومی جدوجہد اور اصلاح کے حق میں نہیں ہے بلکہ تنقید برائے تعمیر کے عمل کو سبوتاژ کرنے کا حربہ ہے۔بلوچ قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ پوری بلوچ قوم کو اگر عروج کی طرف لے جانا ہے تو اسکے لیئے پارٹی بازی، گروہیت، شخصیت پرستی، علاقائیت پرستی اور قبائلیت پرستی کے غار سے نکلتے ہوئے بلوچستان لبریشن چارٹر کی طرح واضح روڈ میپ کے تحت مکمل قومی آزادی کے واضح اور جامع پروگرام کے تحت اپنی قومی پالیسی ترتیب دینا ہوگی تحریک میں موجود غلطیوں، کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیئے مباحثہ قائل کرو یا قائل ہو جاؤ والی پالیسی کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔تب جاکر بلوچ قوم بھی نیدرلینڈ اور یورپ کی طرح ترقی یافتہ اقوام کے صف میں ایک ذمہ دار ویلفیر جمہوری

Ignoble cover up جھوٹ ہے یا کہ کم ظرف ناکارہ یا رزیل جھوٹ ہے جو لیڈر اپنے فاش غلطی بغیر پیش رفت اور ناکامیاب، نامراد پالیسی کو چھپانے کے لیئے بولتا ہے، اسکا مقدم اور فراخ مقصد خود کو اور اپنے گروہ کو بچانا ہوتا ہے۔یہ جھوٹ سماج اور ملک اور تحریک کو بہت زیادہ نقصان سے دوچار کرسکتا ہے اس جھوٹ سے ہمیشہ نالائق نااہل لوگوں کو تحفظ دیا جاتا ہے

اب ہمیں پاکستانی سیاست کی طرح غداری وکفر کے فتوے دینے کے بجائے حقائق کوتسلیم کرتے ہوئے جذباتی پن سے نکلتے ہوئے عقلی ،فکری اور شعوری حوالے سے اپنی جدوجہد میں موجود مسائل کمزوریوں کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انکے حل کے لیئے تجاویز دیتے ہوئے اسے صحیح انقلابی سمت دینا چاہئے تاکہ بلوچ قومی جدوجہد ناکامیابی اور آدھی آزادی کے بجائے مکمل آزادی کے لیئے ہو جہاں اظہار خیال کی آزادی ہو، برابری ،انصاف ،قانون کی بالادستی اور خوشحالی کا بول بالا ہو

ریاست کی طرح کھڑی ہوگی ۔پولینڈ 1918 سے پہلے تین حصوں میں تقسیم تھا جسے ہسٹریا ،ہنگری ،جرمنی اور روس نے تقسیم کیا ہوا تھا ۔اور پولینڈ کے لوگوں کو پروشیا نے مجبور کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام بھی پروشیا کی حکومت کی منظوری سے لیں ۔پولش 123 سال تک زوال میں رہے لیکن انھوں نے اپنے کمٹمنٹ سے مقصدیت کو نہیں چھوڑا بلکہ ساری توجہ اپنی مقصد کو حاصل کرنے پر دی اور آخر کار پولینڈ کے حصے یکجا ہوئے اور پولینڈ پھر سے آزاد ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا ۔اسی طرح یہودی بھی روس ،ہٹلر اور یورپی ظلم وجبر اور استحصال کا ہزاروں سال شکار رہے اور آخر کار اپنی مقصد پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے زوال سے عروج کی طرف آئے ۔لیکن بلوچستان میں لوگوں اور کارکنوں ،جہدکاروں کا رخ مقصد سے ہٹا کر زرائع پر لگا دیا گیا ۔بی این ایم ،بی آر پی او بی این ایف بی ایس ایف و غیرہ مقصد بنائے گئے اور حتیٰ کے مسلح تنظیمیں بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکے ۔کوئی بلوچ جہدکار کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اگر وہ بی این ایم میں نہیں تو اسکی کارکردگی بی این ایم کی لیڈر شپ کی نظر میں نا ہونے کے برابر ہے ۔اگر بی این ایم میں ہے تو بی آر پی ،بی این ایف وغیرہ کے لئے اسکا عمل قابل قبول نہیں ۔پارٹی بازی میں مقصد کو چھوڑ کر ساری پارٹیاں چوں چوں کا مربہ بنے ہوئے ہیں ہر پارٹی اپنی اکثریت ثابت کرنے کے دوڑ میں دوسرے پارٹیوں کے ممبران کو توڑنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں ۔وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ ہم اپنے رویے بدلنے کو تیار نہیں ہیں رویے انقلابی نہیں ہیں سوچ محدود ہے اور مقصد سے توجہ ہٹانے کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں ۔اگر مقصد باقی سب کچھ چھوڑ کر صرف قومی آزادی ہوتا اور رویے انقلابی ہوتے تو اگر بی این ایم جو اس فکر اور سوچ کو پروان چڑھانے کے لیئے کوئی اچھا کام کر رہا ہوتا تو بی آر پی ،بی ایس او ،بی ایس ایف ،بی این ایم (ایم ش) اسکی مدد کرتے ،کیونکہ تمام کا مقصد ایک ہے اور اسی مقصد کی خاطر یہ کام کر رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے مقصد کے بجائے زرائع کو جو مقصد بنائے گئے ہیں ۔جب تک آزادی کے نام پر جہدکاروں کے روئے تبدیل نہیں ہونگے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا ۔اور یہ رویئے ہمیں تقسیم در تقسیم اور انتشار کی طرف لے جائیں گے ۔رویوں کو تبدیل صرف اور صرف صحیح مباحثہ اور تحریر کر سکتا ہے ۔اسلیئے تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بحث مباحثہ ہونا چاہئے تنقید برائے تعمیر کی حوصلہ افزئی کرنا چاہیے ۔اسطرح سے ہمارے رویوں میں تبدیلی آسکتی ہے ۔اب زیادہ تر رویے مسخ ہوچکے ہیں جب تک سب کے رویے انقلابی نہیں ہونگے سوچ قومی نہیں ہوگی فکر قومی نہیں ہوگا مقصد کو اہمیت نہیں دینگے ہزار بار اتحاد و یکتائی قائم کریں نتیجہ پھر تقسیم در تقسیم اور انتشار رہوگا ۔اگر واقعی سب لوگ تبدیلی چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بلوچ قوم زوال سے عروج کی طرف جائے تو یہودی قوم پولش اور سوئٹزرلینڈ کی طرح گروہیت ،پارٹی بازی ،شخصیت پرستی کے بندگلی سے نکلتے ہوئے اجتماعیت قومی سوچ اور مقصدیت کو اہمیت دینا ہوگا ۔اسکے لیئے پہلی اور آخری شرط رویوں میں تبدیلی ہے ۔

جب تک سب کے رویے انقلابی نہیں ہونگے سوچ قومی نہیں ہوگی فکر قومی نہیں ہوگا مقصد کو اہمیت نہیں دینگے ہزار بار اتحاد و یکتائی قائم کریں نتیجہ پھر تقسیم در تقسیم اور انتشار رہوگا ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوال پر پابندی کے باوجود میں ڈاکٹر اللہ نظر صاحب سے ایک سوال کروں گا۔
جناب۔! میرا کوئی مذہب نہیں، میرا کوئی قوم نہیں، میرا کوئی قبیلہ نہیں، میری کوئی ریاست نہیں، میری کوئی شناخت نہیں، میرا کوئی ذات نہیں، میرے باپ کی بھی کوئی حیثیت وشناخت نہیں، مجھے جس گندے نام اور گندے لقب سے نوازو مجھے غرض اور احیاء نہیں کیوں کہ میری کوئی انا نہیں بس اتنا جانتا ہوں میں ایک عام انسان ہوں بس، لیکن ڈاکٹر صاحب سوال یہ ہے کہ
میرا آپ کے آزاد بلوچستان میں کیا مقام ہوگا ؟

صرف ایک سوال۔۔۔۔!

تحریر۔ باغی میر

تخلیق انفرادی عمل ہوتا ہے اور اس کیلئے تربیت پر مشتمل تعلیم اور ادارے نہیں بلکہ آزاد ذہن اور کسی بھی کیفیت اور مخصوص نظریے کے دباؤ سے متاثر ہوئے بغیر آزاد سوچ نا گزیر ہوتا ہے ۔انسان کو لیکر اس پر تحقیق اس ضمن میں مفروضوں، مشاہدوں، تجربوں اور نظریوں کا مجموعہ انسان کی بقاء تہذیب اور اخلاقی اصولوں کی صورت میں نظر آتا ہے اور اس بابت سماجی و معاشرتی ڈھانچوں کی تشکیل کیلئے مختلف ترتیب اور ضابطے اپنائے گئے تاہم تجربوں اور انسانی ارتقاء اور شعور کے محدود اور فطری تقاضوں سے نمٹنے کیلئے محدود وسائل کی بناء پر مادیت سے تصوراتی سوچ ماوراہی اور مفروضاتی نظریوں کی بنیاد بن کر مذہب کی وجہ بنی جو انسان کی ارتقائی عمل کو عمومیت اور تخلیقی عمل سے موڑ کر انسان اور انسانیت کی تعریف بدل دی جو طاقت کو معیار بنا کر انسان کو طبقوں میں تقسیم کر کے حاکمیت اور مغلوبیت کی پرورش کا باعث بنا۔ انسان فطری یا جبلی طور پر آزاد بے باک بے ساختہ اور تخلیقی ہوتا ہے جو کہ ضابطوں اصولوں اور مغلوبیت کا ضد ہے جسے ضابطوں میں لاکر تہذیب کے نام پر اسکی انسانی خصلتوں کا بھلی چڑھا کر اسے اندھا پاج لولا لنگڑا اور بہرہ بنا کر اسے اخلاق کے نام پر مہذب کا لیبل چڑھا کر اسکی فطرت جبلت کا قتل کیا جاتا ہے ۔طویل عرصے پر محیط کوئی بھی عمل سوال تحقیق اور تجزیے سے ماورا بن کر اصول اخلاق اور ضابطہ بن جاتا ہے جو قبولیت کا درجہ پا کر انسانی معیار کا جز بنا دیا جاتا ہے۔ انسان سائنسی تعریف میں ایٹم کا وہ مجموعہ ہے جو حرکت پذیر یا اور حالت بدلنے اور فطرت سے نمٹنے کی صلاحیت رکھنے والا مرکب ہے جس کی تناظر میں تخلیق اس کی فطرت اور صلاحیت ہے آزادی اس کی خصلت ہے ۔لیکن تخلیق اور تحقیق ہماری معاشرتی تربیت اور سماجی حیثیت کے بنانے جیسے مفروضوں کا شکار بن کر جنم سے قبل ہی کھوکھ میں ہی دم توڑ جاتا ہے اور اس کے بعد جس خوبصورتی اور چاہت سے ہم انسان سے پرزہ بننے کو قبول کر لیتے ہیں کہ جس کے بعد تخلیق تحقیق کا سوچ بھی گناہ اور غیر انسانی و غیر تہذیبی جیسی لفظوں کی صورت میں جرم بن جاتا ہے اس سارے عمل سے ترتیب سے، بنائے گئے ضابطوں سے اور قبولیت کا درجہ پانے والے اصولوں اور نام نہاد اخلاقی بندھنوں سے بغاوت تخلیقی سوچ کے تحت ہی ممکن ہوتا ہے جو یقینا عمومیت نہیں بلکہ غیر معمولی عمل ہوتا ہے ۔نوآبادیات میں انسان کی تخلیق، تحقیق پر پابندی اور سوچ کو تربیت کے ذریعے تابع بنانے کیلئے تعلیم و دیگر اس بابت باقائدہ ذہن سازی کا موثر لائحہ عمل اپنایا جاتا ہے کہ اس سے نجات کی عمومی جہد بھی انہی ضابطوں کے اثر سے خود کو نکال نہیں سکتا اور کنویں کا مینڈک بن کر ہمیشہ نجات کی خودفریبی میں مبتلا رہتا ہے ۔مذہبی شخص مادیت سے ماوراء اور تصوراتی خیالات پر مبنی سوچ کے حامل سماج نوآبادیت سے نجات اور انسانی معیار کو برتری کی امتیاز کے پیمانے پر پرکھ کر غالب کی جگہ کو پالینا ہی نجات اور آزادی سمجھ بیٹھتا ہے ایسے معاشروں میں چہرے بدلتے ہیں سماج سوچ اور فکر نہیں ۔انسان کی تعریف میں آزاد ذہن پہلا اور بنیادی نکتہ ہوتا ہے اور آزادی کا شعور ہی اسکی وجود کا اظہار ہوتا ہے یہ کسی مقصد اور منزل سے عبارت نہیں ہوتا کہ اس کے پانے کیلئے طویل جہد کے بعد اسکی شعور کو حاصل کیا جائے ہاں جہد اسکی معاشرتی سطح پر مجموعی اظہار کیلئے

ضرور ہوتا ہے لیکن اس بابت جہدکار اسکی شعور کے ساتھ ہی مزاج رویہ سوچ اور ذہنی و اظہار کی سطح پر اس کا عملی نمونہ بن جاتا ہے۔ بلوچ تحریک آزادی میں حالیہ قومی تشکیل کے مرحلے میں مزاج اور رویوں کی تعمیر بارے تنقیدی عمل کے جواب میں معاون بننے کی بجائے ڈاکٹر نظر اور اسکے دوستوں کی جانب سے غیر معمولی انداز میں گالیوں الزامات اور فتوؤں کا جو رویہ اپنایا گیا ہے یقیناً یہ کسی طور آزادی کی جہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ سوال سے انکار تنقید سے خوف اور اصلاح سے نفرت پر مشتمل جہد ردعمل اور انتقامی تو ہو سکتا ہے آزادی کیلئے شعوری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ردعمل اور انتقام کی خاصیت عمل کے ردعمل میں وہی عمل دہرانا اور وہی طاقت اور حیثیت حاصل کرنا جو فریق مخالف کی ہے اس سارے دورانیے میں نجات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ نو آبادیات کیخلاف مسلح جہد کی افادیت سے انکار نہیں لیکن آزادی کی جہدکار کے سامنے نو آبادیات سے چھٹکارہ پانے سے زیادہ قومی تشکیل کا مرحلہ اسکی جہد کے خدوخال کا اظہار اور اسکے اور نو آبادکار کے درمیان انسانی تمیز اور شعور کے حدود کو واضح کرتا ہے۔

ہم کسی بھی سوال کو تخریب سمجھنے سے قبل اسکی نوعیت اس کی افادیت اثرات اور اسکی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ذرا اس جانب توجہ دیں یقیناً اس کا جواب ہماری دانست کے تحت ہماری اپنی صوابدید پر ہی ہوگا کوئی سوال تو ہم سے پوچھ سکتا ہے لیکن جواب کا حق ہی تھی۔ لیکن آج کا اللہ نذر سوال سے خائف کیوں؟ تنقید کو تخریب سمجھنے کا منطق کیا؟ قومی تشکیل سے باغی کیوں؟ جہد کے ضروریات سے چشم پوشی کی وجہ کیا؟

آج سوال پر تنقید پر قومی تشکیل اور رویوں کی انسانی بنیادوں پر تعمیر کا تقاضہ کرنے پر اسلم بلوچ زدزبان عام اور کتاب کے پیروکاروں کے گالیوں گندے القابات اور حسب نسب ذات پات اور نہ جانے کیا کیا ناموں سے نوازے جارہے ہیں۔ اسلم بلوچ سے میں نہیں ملا، اسلم بلوچ کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، ڈاکٹر کے پیروکاروں کا کہنا ہے وہ بلوچ نہیں، بہت بڑا تعلیمی ڈگری بھی نہیں رکھتا۔ اسلم بلوچ بی ایس او کا چیئر مین بھی نہیں گذرا بلکہ وہ سیاسی اداروں میں پرورش ہی نہیں پایا، ڈاکٹر کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ اسلم بلوچ ایک بندوق بردار ہے سنگت حیر بیار کے ساتھ ایک معمولی عام سے بندہ یا پھر دوست رہ چکا ہے غرض یہ کہ اسکی کوئی شناخت نہیں حتیٰ کہ ڈاکٹر کے پیروکار تو اسے بلوچ کی سند بھی دینے کو تیار نہیں۔ اب یہاں سوال پر بھی تو پابندی ہے۔ اسلم بارے انقلابیوں کا سوچ رویہ اور تاثر دیکھ کر مجھے اپنے بارے میں خدشہ اس شدت سے ستا رہا ہے کہ سوال پر پابندی کے باوجود میں ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کروں گا جناب ۔۔۔۔! میرا کوئی مذہب نہیں، میرا کوئی قوم نہیں، میرا کوئی قبیلہ نہیں، میری کوئی ریاست نہیں، میری کوئی شناخت نہیں، میرا کوئی ذات نہیں، میرے باپ کی بھی

بلوچ تحریک آزادی میں حالیہ قومی تشکیل کے مرحلے میں مزاج اور رویوں کی تعمیر بارے تنقیدی عمل کے جواب میں معاون بننے کی بجائے ڈاکٹر نظر اور اسکے دوستوں کی جانب سے غیر معمولی انداز میں گالیوں الزامات اور فتوؤں کا جو رویہ اپنایا گیا ہے یقیناً یہ کسی طور آزادی کی جہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں

جو ہماری اپنی دانست اور تجربہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا پھر ہم سوال پر ہی پابندی لگا کر اپنے جواب کے حق سے کیوں تجاوز کرتے ہیں؟ تنقید مجھے میری عمل پر غور کی دعوت اور اس میں اصلاح کا موقع دینے کا فلسفہ ہے پھر ہم اس پر خوف میں مبتلا ہو کر اسے تخریب قرار دیکر اپنے عمل پر شق اور اس میں خامی کے خوف کا اظہار کیوں کرتے ہیں۔ انا جو میں ہوں اسے تسلیم نہ کرنے کا نام ہے۔ جب ہم اپنی شخصیت سماجی حیثیت کا تعین اپنے طور پر کر کے اسے دوسروں پر برتری اور امتیاز گردان کر اپنے ذات میں طبقہ بن جاتے ہیں تو ہم نو آبادکار کی روپ عملاً دھار لیتے ہیں جہاں نو آبادکار اور مظلوم میں طاقت کا توازن یکساں ہو کر دونوں استحصالی قوتیں بن جاتی ہیں۔ ایسے میں رویے سخت مزاج میں ترشی اور نو آبادکار کی نازوادا مظلوم کے اظہار اور عمل میں نظر آنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر اللہ نذر کتاب کا پیروکار، بی ایس او کا سابق چیئرمین نظریاتی ہونے کا مثال مڈل کلاس کا اعزاز کا حامل یعنی انبیاء جیسے صفت بچپن سے سمیٹے نوجوانوں کی ہر دل عزیز ہونے کے بعد ان سے جہد میں بہت ساری اچھائیوں کی توقع رکھی جار

کوئی حیثیت و شناخت نہیں، مجھے جس گندے نام اور گندے لقب سے نوازو مجھے غرض اور واحیا نہیں کیوں کہ میری کوئی انا نہیں بس اتنا جانتا ہوں میں ایک عام انسان ہوں بس، لیکن ڈاکٹر صاحب سوال یہ ہے کہ میرا آپ کے آزاد بلوچستان میں کیا مقام ہوگا؟ میں اسلم سے نہیں ملا تو میں ڈاکٹر شے گویرا سے بھی نہیں ملا۔ میں ماتما بدھ کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ میں عیسیٰ بن مریم کی ذات سے بھی نہیں واقف۔ میں سقراط، فینن، سارتر، منڈیلا۔ غرض یہ کہ کسی بڑے انسان سے ذاتی نہیں ملا لیکن ان کے افکار ہی میرے لئے انکی شناخت ہیں۔ اسلم کو کوئی شناخت مت دو، وہ بندوق بردار تھا، وہ چیئرمین بی ایس او نہیں رہا۔ وہ اداروں کے تقدس سے ناواقف ہے۔ وہ کتاب کو کیا جانے۔ پھر سوال اٹھتا ہے کہ اسلم میں وہ کیا ہے جو علم نہ رکھنے کے باوجود ہم سے اور کتاب کے پیروکاروں سے قبل ہی آزادی کا شعور پا کر اس میں عملاً حصہ دار بن گئے۔ پھر کیا ہے کہ جب جنگ عروج پر پہنچا تو اس نے جنگ برائے جنگ کے جنوں میں غرق ہونے کی بجائے قومی تشکیل اور رویوں مزاج کی تعمیر کا مرحلہ متعارف کرایا۔ جب

سب انا ہیر وازام کا شکار ہوئے وہاں اسلم نے اپنی ذات پر تنقید کا محض یہ کہہ کر جواب دیا کہ میں بس ایک عام انسان ہوں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ۔اس سارے عمل میں مجھے کرشنا مورتی کا یہ قول یاد آتا ہے کہ علم تربیت ادارہ اور کسی خاص نوعیت کے ماحول کا محتاج نہیں بلکہ علم آگاہی کا نام ہے خود سے آگاہ ہونے کا نام ہے اور اسی فلسفے کے تناظر میں تخلیق انفرادی عمل ہے جو خودشناسی کے بعد بے ساختگی سے ابھرتا ہے۔اب میں کیسے اسلم کو انسان اور خودشناسی اور آگاہ ہونے سے روکوں ۔ایک سوال ہمیشہ ستائے جاتا ہے کہ اداروں میں نہ رہ کر، عہدہ نہ لیکر تربیت نہ پا کر بھی ہمیشہ اسلم ہم سے پہلے کیوں پیش بین بن جاتا ہے۔ہماری علمی رہنمائی کی رائیں کیوں اسلم سے نکلتی ہیں ۔کتاب کے پیروکاروں کو کتاب کے تقاضوں اور کتاب کی آواز بھی تب سنائی کیوں دیتی ہیں جب سنگت حیربیار اور اسلم آزادی کی راہیں متعین کرتے ہیں ۔۔لیکن کیا کریں اسلم معذرت کے ساتھ ہماری تربیت یونیورسٹی اور بی ایم سی کے پر آسائش ہاسٹلوں میں پروٹوکول کے فلسفے کے تحت ہوا ہے ہمارا نظریہ خودشناسی، علمی اور انسانی آزادی کے بنیادی شعور کے تحت نہیں بلکہ چیئرمین نہ بنائے جانے پر بنتا اور بدلتا ہے ۔ہم اپنی لیڈرشپ پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں اس لئے آپ ہماری ہدف تنقید ہو اور رہو گے

!۔۔۔

مجھے ڈاکٹر اللہ نذر کے اخلاص پر شک نہیں نہ ہی میرا اس سے کوئی برابری کا دعوی ہے ۔کیوں کہ میں عملی جہد کا حصہ ہی نہیں اور نہ ہی آج تک ذرا بھی اس تحریک کو کوئی مدد یا حصہ ڈالا ہے لیکن اس خطے کا عام سا انسان ہونے کے ناطے میں صرف ایک سوال انتہائی مخلصانہ انداز میں کرتا ہوں امید ہے ڈاکٹر صاحب اسکا جواب دیکر میرے اور مجھ جیسے دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے خدشات کو دور کریں گے جو تحریک کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے پیروکاروں کے رویے اور سوال اور تنقید پر اپنائے جانیوالے سخت موقف سے جنم لے چکے ہیں۔

1 ۔کالونائزیشن کے زیر تسلط قابض قوم کی آزادی کی مجموعی تعریف اور اس ضمن میں جہد کے خدوخال کیا ہونے چاہئیں ؟

امید ہے مجھے آپ کے پیروکار جو اپنے اور میرے انسانی بنیادی حقوق آزادی کیلئے برسرپیکار ہیں گالیوں سے نوازنے کی بجائے میرے اس سوال کو سوال ہی سمجھ کر آپ سے اس کے جواب کا تقاضہ کرینگے نہ کہ مجھے سازشی غدار اور دشمن قرار دیکر اسے یکسر مسترد کرینگے۔

☆☆☆☆☆☆

ہم کسی بھی سوال کو تخریب سمجھنے سے قبل اسکی نوعیت اس کی افادیت اثرات اور اسکی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ذرا اس جانب توجہ دیں یقیناً اس کا جواب ہماری دانست کے تحت ہماری اپنی صوابدید پر ہی ہوگا کوئی سوال تو ہم سے پوچھ سکتا ہے لیکن جواب کا حق جو ہماری اپنی دانست اور تجربہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا پھر ہم سوال پر ہی پابندی لگا کر اپنے جواب کے حق سے کیوں تجاوز کرتے ہیں؟

بی ایل ایف پالیسی بیان، حقائق سے انحراف

گوہرام اہڑی

مسلح تنظیم بی ایل ایف کے سپریم کونسل کی جانب سے پالیسی بیان کا اجراء، اور سنگت حیربیار مری وان ساتھیوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنا، نہ ہی غیر متوقع عمل تھا، اور نہ ہی حیران کن ____ بلکہ بلوچ قومی تحریک میں 2006ء سے اُبھرنے والے اختلافات اور تضادات نے (جن کا انکشاف 2010ء میں حیربیار مری نے اپنے ایک اخباری بیان میں بھی کیا تھا۔) میں فعال عوامل نے ایسی صورتحال پیدا کردی تھی، اور ان اختلافات، کوتائیوں اور کمزوریوں سے متعلق اٹھائے گئے سوالات نے ایسی فضاء بنا دی تھی، کہ جس نے بالآخر اس آتش فشاں کو فلیتہ دکھا کر بی ایل ایف کی سپریم کونسل کو تضاد بیانی کرنے پر مجبور کردیا۔ تضاد بیانی اسلئے، کہ اس پالیسی بیان میں اصل حقائق اور اختلافی نقاط کو پس پشت ڈال کر، صرف حیربیار مری اور ان کے ساتھیوں کو ذمہ دار ٹھہرا کر تمام ملبہ ان پر اسلئے گرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیربیار کے ساتھیوں نے سوشل میڈیا میں حقائق پر مبنی سوالات اٹھا کر اختلافات کی حقیقت کو سامنے لایا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا، کہ بی ایل ایف جیسی آزادی پسند، مسلح اور ذمہ دار تنظیم کی سپریم کونسل (جو کہ اُٹھتے بیٹھتے مقدس اداروں کی ثناء خوانی کرتے رہتے ہیں۔) اسی ادارے کی تقدس کو پیش نظر رکھ کر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ان اختلافات کی حقیقت کو مانتے، اور انہی اختلافات کو بنیاد بنا کر مدلل انداز میں اپنی بات رکھتے۔ جو کہ بی ایل اے اور بی ایل ایف کی قیادت، نواب خیر بخش مری، حیربیار مری، براھمدغ بگٹی اور ڈاکٹر اللہ نذر کے درمیان ہیں جن کی بناء پر آج حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں۔ تو شاید بات بنتی۔ لیکن بی ایل ایف کی قیادت نے معروضی حالات اور تمام حقائق سے کنی کترا کر سوشل میڈیا میں حقائق کی روشنی میں اٹھائے گئے ان سوالات کو کہ جن کی بنیاد آزادی پسندوں کے درمیان ابھرنے والے اختلافات پر ہیں، سے انکار کرتے ہوئے اختلافات کی نشاندہی کرنے والی اس حقیقت کو نہ صرف "منفی پروپیگنڈہ" قرار دیا، بلکہ اپنے آپ کو تمام باتوں سے بری الذمہ بنا کر بناء دلیل کے حیربیار وان ساتھیوں کو تحریک کیلئے نقصاندہ قرار دیا۔ یہ رویہ از خود پر تضاد اور حقائق سے آنکھیں چرانے اور سیاسی ورکروں کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ پاکستانی سیاسی نظام سے مستعار لیا گیا وہ سیاسی رویہ ہے۔ جس کے تحت سیاسی مخالفین کو بلا جواز و دلیل کے فوری طور پہ ایجنسیوں کا سرٹیفکٹ جاری کرنے کی روایت عام ہے۔ (ویسے بھی بی ایل ایف کی قیادت کی اکثریت ماضی میں نیشنل پارٹی اور چند ایک کی بی این پی جیسی پارلیمنٹ پرست سیاسی جماعت سے وابستہ رہی ہے۔)

سوشل میڈیا میں اُٹھائے گئے سوالات اور حقائق پر مبنی کمنٹس (چند ایک غیر مدلل و ذاتیات پر مبنی کمنٹس کے علاوہ) کیا جواب طلب نہیں ہیں؟ کیا معروضی حالات کے پیش نظر قومی تحریک کے حوالے سے کمزوریوں، کوتائیوں اور باہمی اختلافات سے متعلق تنقیدی جائزہ غلط عمل ہے؟ ادبی وسیاسی اصطلاح میں حقائق سے متعلق تجزیہ اور تنقیدی جائزہ علم کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیوں کہ جانچ پرکھ ہی کی بنیاد پر معیارات کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ پاؤلو فریرے کے مطابق: "تنقیدی شعور، بیدار انسانوں کو تباہ کن تعصب کی جانب نہیں دھکیلتی، بلکہ انسان کو ذمہ دار فاعل کے طور پر تاریخی پروسس میں داخل کرتی ہے۔ تنقیدی شعور کی بیداری سماجی بے چینی کے اظہار کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی بے چینی استبدادی صورتحال کے حقیقی اجزائے ترکیبی ہیں۔ تنقیدی جذبے سے بھرپور انقلابیت ہمیشہ تخلیقی ہوتی ہے۔ اور آزادی دلاتی ہے۔ اس کے بغیر حقیقت کے متحرک ہونے کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔" جس طرح تنقید مبنی بر حقیقت ہونا ہے، اسی طرح تنقید کا جواب بھی مبنی بر حقیقت ہونا چاہیئے۔ نہ کہ متعصبانہ اور جذباتی۔ بی ایل ایف کی قیادت اور سپریم کونسل کا حکم صادر کرنے والا آمرانہ انداز لیئے جاری کردہ یہ پالیسی بیان نہ تنقید کے زمرے میں آتا ہے، نہ ہی حقیقت پر مبنی تنقید کے جواب کے زمرے میں۔ بلکہ اس مخصوص ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کے تحت احساس برتری کا رجحان و رویہ پنپتا ہے۔ اسی مخصوص ذہنیت کے ہی تحت بلا تحقیق و حقیقت معلوم کرنے کے مکران میں ان عام بلوچوں کو مخبر قرار دے کر ٹارگٹ کرکے قتل کرنے کے حکم صادر کئے جاتے ہیں۔ جن کی قومی آزادی کی جنگ کا بی ایل ایف دعویدار ہے۔ ان افراد کے قتل سے متعلق نہ صرف بار بار بی ایل ایف کی قیادت سے وضاحت طلب کی جاتی رہی ہے، بلکہ یہ بات بھی زبان زد عام ہے کہ بی ایل ایف کے اگر کسی ممبر کی کسی سے ذاتی دشمنی ہے، کوئی ذاتی عناد ہے، یا کوئی پرانی رنجش ہے۔ تو وہ اپنی بغض وعناد میں اپنے انتقامی جذبے کو تسکین پہنچاتا ہے۔ اور پھر دوسرے ہی روز بی ایل ایف قیادت کی جانب سے بلا تحقیق کے مقتول کو مخبر قرار دے کر اس کے اور اس کے خاندان کی پیشانی پر بدنامی کا کلنک سجایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، کہ اس طرز عمل کی وجہ سے بی ایل ایف کے بعض ہمدرد و حمایتی بھی ٹارگٹ بن چکے ہیں۔ اس سوچ کے ساتھ ساتھ اگر بی ایل ایف کی خودنمائی اور لفاظی کرنے کے طرز عمل اور سوچ (جو کہ ان کے اخباری بیانات، لیڈران کے انٹرویوز اور پمفلٹس میں نمایاں ہیں۔) کو پیش نظر رکھ کر اگر حقیقت کو پرکھا جائے تو اپنے آپ کو سپریم تصور کرنے، (علاقائیت کی سوچ کے باوجود) اپنے آپ کو خود اپنی جانب سے قومی لیڈر کا نام دے کر شخصی ابھار کو بڑھاوا دینے اور گروہیت کی ان کی سوچ و ذہنیت کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ لفاظی وخودنمائی کی اس طرز عمل کے ذریعے بی ایل ایف کی قیادت

شاید کہ چند ایک سیاسی ورکروں کو گمراہی کی راہ پہ ڈال سکے۔ لیکن کیا وہ اس سوچ اور حقائق کو پرکھنے کی تجزیوں اور سمجھ بوجھ پہ قدغن لگا سکتا ہے؟ لفاظی وخودنمائی کی طرزِ عمل سے قطع نظر اگر حقائق کی بنیاد پر تجزیہ کیا جائے تو یہ سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں، کہ کیا بی ایل ایف کی قیادت نے جدوجہد کے اس تمام عرصے میں اپنی کارکردگی اور انقلابی طریقہ کار کو بروئے کار لا کر وہ کارہائے نمایاں سرانجام دی ہے، کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ واقعی بی ایل ایف قومی تنظیم کی حیثیت حاصل کرچکی ہے؟ یا قومی تنظیم کے معیار پر پوری اترتی ہے؟ یا قومی تنظیم کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے؟ کہ تمام بلوچ قوم سیاسی ورکروں کو گمراہ کرنے کی خاطر یہ الفاظ دہرائے کہ "آزادی پسندوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔" کسی قومی رہبری اور وژنری لیڈری کے دعویداری کرنے والے کسی تنظیمی سربراہ کی اس طرح کی تضاد بیانی کو کیا کہا جائے؟ اسی دوغلے طرزِ عمل نے ہی تو حقائق سے انحراف کی سوچ کو پروان چڑھایا۔ اور اب اتنی قربانیوں کے بعد بلوچ قوم آزادی پسندوں کے درمیان تقسیم در تقسیم وگروہیت وعلاقائیت کے نتائج کو بھگت رہا ہے۔ اگر ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر معروضی حالات اور حقائق کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ کون قومی تحریک کیلئے فائدہ مند ہے؟ اور کون نقصاندہ......؟

یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ بی ایل ایف کے اگر کسی ممبر کی کسی سے ذاتی دشمنی ہے، کوئی ذاتی عناد ہے، یا کوئی پرانی رنجش ہے۔ تو وہ اپنی بغض وعناد میں اپنے انتقامی جذبے کو تسکین پہنچاتا ہے۔ اور پھر دوسرے ہی روز بی ایل ایف قیادت کی جانب سے بلاتحقیق کے مقتول کو مخبر قرار دے کر اس کے اور اس کے خاندان کی پیشانی پر بدنامی کا کلنک سجایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے بی ایل ایف کے بعض ہمدرد وحمایتی بھی ٹارگٹ بن چکے ہیں۔

اسے اپنی نجات دہندہ (جو کہ بی ایل ایف کی قیادت اپنے تئیں سمجھتا ہے) تنظیم تسلیم کرنے لگا ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ بی ایل ایف ایک گروہی وعلاقائی تنظیم ضرور ہے، قومی نہیں۔ تو پھر اس کی قیادت کو کیا حق حاصل ہے، کہ وہ اس طرح سے احکامات صادر کرکے کسی بلوچ کو حقائق کو سامنے لانے اور اختلافات کو عوامی سطح پر لانے پر بلاجواز ودلیل کے قومی تحریک کیلئے نقصاندہ قرار دیں۔

گروہیت وعلاقائیت کی اسی سوچ نے نہ صرف بلوچ قومی تشکیل میں رکاوٹیں ڈال دی ہیں، بلکہ بلوچ قومی تحریک میں اختلافات کی خلیج کو بھی وسیع تر کردیا ہے۔ ڈاکٹر اللہ نذر نے طے شدہ پروگرام کے تحت وش ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے (بی ایل ایف کے) اثرورسوخ کے علاقوں مشکے وآواران کی نشاندہی کردی۔ اور اپنی جدوجہد کے محور کو مکران کے علاقے میں موثر قرار دیا۔ اور اس طرح انہوں نے قومی جدوجہد کی بجائے اپنے "وارلارڈ" والی حیثیت کو آشکار کردیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر اللہ نذر کا یہ انٹرویو جس میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں ایک باؤنڈری کھینچ کر اپنے اثرورسوخ کے علاقوں کی نشاندہی کی۔ اس وقت وش ٹی وی پہ نشر ہوا۔ جب مکران میں ڈاکٹر اللہ نذر کے زیر اثر متاز عہ اتحاد بی این ایف کی کال پر الیکٹرانک وپرنٹ میڈیا کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ ان کی بندش چل رہی تھی۔ خاص طور پہ بلوچ جہدکاروں کی کاروائیوں کو کوریج نہ دینے پر وش ٹی وی کے خلاف شدت سے برہمی کا اظہار کیا جارہا تھا۔ اور پھر اچانک وہ احتجاج نہ صرف خاموشی میں بدل گیا، بلکہ خلافِ توقع فوری طور پہ ڈاکٹر اللہ نذر کا انٹرویو وش ٹی وی پہ نشر ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اختلاف رکھنے اور اختلافی امور پہ سوالات اُٹھانے والوں کو وارسائیکو اور نیم پاگل قرار دیتے ہوئے اپنی احساس برتری کا اظہار کیا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اختلافات کی حقیقت سے یکسر انکار کرتے ہوئے

جب کوئی لیڈر، یا کسی بھی تنظیم کا سپریم کونسل لب کشائی کرتا ہے۔ تو اس وقت وہ اپنے آپ کو، اپنے ادراک کو اور اپنے زاویہ نظر کو بیان کررہا ہوتا ہے۔ اگر یہ لب کشائی حقائق کو جانچ کر ان کی سچائی کو اجاگر کرتا ہو تو وہ بیان بہت ہی زیادہ جاندار، بامقصد اور قابل اعتماد ہوگا لیکن اگر سچائی کو جانچنے اور معروضی حقائق کو پرکھنے کے باوجود محض لفاظی اور کتابی اصطلاحات کا سہارا لیا جائے گا۔ تو اس کے اس بیان سے غیر ذمہ دارانہ پہلو نمایاں ہوگا۔ بی ایل ایف سپریم کونسل کا بیان بھی زمینی ومعروضی حقائق سے ہٹ کر محض لفاظی اور اصطلاحات کے ہیر پھیر پہ مبنی ہے۔ یہ طرزِ عمل بلوچ سیاست پہ ماضی کے وہ اثرات ہیں۔ جس نے بلوچ سیاست کو اپنی گرفت میں لیکر رٹے رٹائے سیاسی اصطلاحات کی گرفت میں جکڑ لیا ہے۔ بدقسمتی سے ماضی میں سرخ انقلاب کے زیر اثر انہی رٹے رٹائے سیاسی اصطلاحات ونعروں کی سچائی وحقیقت کو سمجھنے کی بجائے محض لفاظی کے سہارے آگے بڑھتی رہی ہے اور بلوچ سیاسی لیڈروں کی ان اصطلاحات ونعروں کو بلوچ سماجی اقدار وروایوں سے مطابقت دینے کی بجائے، کم علمی، بدنیتی کی روش، اپنی شخصیت کو اُبھارنے کے رجحانات اور انقلابی اقدامات کو بلوچ سماج میں پنپنے کیلئے عملی اقدامات سے گریزاں رہنے کے اسباب نے بلوچ سیاسی ورکروں کو ہمیشہ سے "دائرے کا قیدی" بنا کے رکھ دیا۔ جس کے اثرات آج بھی بلوچ سیاست، خاص طور پہ متوسط طبقے کا نعرہ لگانے والوں کے ہاں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے حقائق کو جانچنے وپرکھنے اور الفاظ وادراک کو عملی اقدامات، سچائی اور معروضی حالات کو آشکار کرنے سے مطابقت دینے کی بجائے ان کی سوچ اسی "لامتناہی دائرے" کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ بدلتی ہوئی صورتحال اور آج کے معروضی حالات کے باوجود بھی اس روش میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آرہی ہے۔ بی ایل ایف کی قیادت اور ڈاکٹر اللہ نذر

کی زیر اثر بی این ایم و بی ایس او آزاد کے کسی بھی لیڈر کا اخباری بیان یا انٹرویو ملاحظہ کریں۔اس میں یہ روش نمایاں طور پر نظر آئے گا۔بی ایل ایف سپریم کونسل کا یہ پالیسی بیان بھی اسی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔چونکہ آج بلوچ قومی تحریک آزادی کے اس ارتقائی مرحلے میں آزادی کیلئے جہد کرنے والے جہدکاروں کی اکثریت کا تعلق (خاص طور پہ بی ایل ایف کی قیادت کا) ماضی میں نیشنل پارٹی، بی ایس او و بی این پی جیسی پارلیمانی پارٹیوں سے رہا ہے۔جہاں "لفاظی" کے سہارے بیان بازی کی روش و رجحان ہمیشہ سے غالب رہا ہے۔اس قومی جہد کے دوران اکثر جہدکاروں نے قومی جہد و انقلابی تقاضوں کے تحت اپنی اس روش میں ایک حد تک تبدیلی لائی ہے۔جو ان کی ادراک و فہم کا عملی مظاہرہ ہے۔لیکن بی ایل ایف، بی این ایم اور بی ایس او آزاد کی قیادت میں اس فہم و ادراک اور معروضی حالات کی تبدیلی کو سمجھنے اور اپنی روش میں تبدیلی لانے کے امکانات آج بھی مفقود نظر آتے ہیں۔(اس بات کو سمجھنے کیلئے خاص طور پہ ڈاکٹر اللہ نذر، خلیل بلوچ، منان، بانک کریمہ اور دیگر لیڈران کے بیانات و انٹرویوز کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔کہ ان کے ایک دن قبل اور اگلے دن کے بیانات میں ان کے موقف میں کیونکر تبدیلی اور بیشتر ابدلنے کا تاثر نمایاں نظر آتا ہے۔) اسی لئے لفاظی و اصطلاحات کا سہارا لینے والی بی ایل ایف کی قیادت جو اپنی احساس برتری جتاتے ہوئے بار بار دوسروں کو قبائلی، رد انقلابی و غیر تعلیم یافتہ اور اپنے آپ کو برملا سیاسی، انقلابی اور متوسط طبقے کا نمائندہ کہتے ہیں۔اپنی احساس برتری جتانے والی اس روش پہ غور کریں۔اور لینن کی متوسط طبقے کے بارے میں کہے ہوئے الفاظ پر ضرور نظر دوڑائیں کیونکہ انقلاب و آزادی محض کتابی باتوں اور لفاظی کے بل پر برپا نہیں ہوتے۔بقول ماؤزے تنگ "انقلاب صرف لفاظی کا نام نہیں۔" لفاظی سے سمت کا تعین نہیں ہو سکتا، بلکہ انقلابی اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔اور پھر انقلابی و آزادی پسند نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔اور یہی راستے سے بھٹکنے والے پھر گروہیت و علاقائیت کی سیاسی رویے کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔انسانی زندگی کی تعمیر، سماجی تبدیلی، انقلاب اور قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیاد فکر و مقصد پہ رکھی جاتی ہے۔یہ فکر و مقصد اس وقت سماجی تبدیلی، انقلاب اور قومی آزادی کا روپ دھار سکتا ہے۔جب حکمت عملی کے ساتھ فکر و مقصد کو عمل سے مربوط کیا جاتا ہے۔پاؤلو فریرے لکھتے ہیں: "آزادی ایک معتبر عمل ہے۔یعنی دنیا کو بدلنے کیلئے انسانوں کی سوچ اور عمل کا ملاپ ہے۔" فکر و مقصد اور اس کو عمل کے ذریعے آگے بڑھانا اور ممکن بنانا انقلاب و آزادی کا مظہر ہے۔فکری آگہی رکھنے والے انقلابی و آزادی پسند ہر نقطے پر غور و فکر کرتے ہیں۔اور پھر اپنی فکر کو عملی جہد کے ذریعے ممکن بناتے ہیں۔اسی فکر و مقصد کو عمل سے مربوط کرنے کی بنیاد پر بلوچ جہدکاروں نے قومی آزادی کی جہد کو منظم کیا۔1996ء میں اس سلسلے میں بلوچ لبریشن آرمی کی بنیاد رکھی گئی۔اس سے قبل قومی آزادی کی تحریک جو کہ غیر منظم اور قبائلی بنیادوں پر استوار تھی۔اس کے اس تسلسل کو ایک تنظیمی شکل دے دی گئی۔یہ کاوش مرہون منت تھی ان کوششوں کی کہ جب اس سے قبل حیر بیار مری نے ہلمند افغانستان سے تحریک کو منظم کرنے کیلئے اپنی کوششیں شروع کیں۔ان کی ان کاوشوں میں استاد واحد قمبر بھی ان کے ہمراہ تھے۔اور وہ حیر بیار کی ان کوششوں کے گواہ ہیں۔ازاں بعد جب حیر بیار مری وزیر مواصلات تھے تو در پردہ وہ قومی تحریک کو منظم شکل دینے کیلئے کوشاں تھے۔دن کو وہ اگر اپنے دفتر میں ہوتے تو رات کو جب دوسرے وزراء عیاشیوں اور دعوتیں اُڑانے میں مصروف رہتے تھے۔حیر بیار مری اپنے انہی تنظیمی ساتھیوں کے ہمراہ قومی تحریک کے کاموں کو ایک ترتیب دینے اور دیگر کام و امور کو آگے بڑھانے کیلئے بھاگ دوڑ کرتے رہتے تھے۔ان کی ان کاوشوں کا بھی واجہ واحد قمبر گواہ ہیں۔1996ء میں قومی تنظیم کی بنیاد بلوچ قومی آزادی کیلئے مسلح و سیاسی جدوجہد، بلوچ قومی وحدت کو منقسم سے منظم شکل دینے، قبائلی بنیادوں کی بجائے بلوچ قومی تشکیل کیلئے شعوری آگہی کیلئے کام کرنے، آزاد بلوچ سماج کی تشکیل اور قومی آزادی کے بعد انصاف، برابری و انسانی حقوق اور سیکولر بنیادوں پر بلوچ ریاست کی تشکیل پر رکھی گئی، چارٹر بھی ان ہی نقاط کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے، ایک قومی بیرک متعارف کرایا گیا، جس کا اوپری حصہ سرخ (انقلاب و آزادی کا نشان) نچلا حصہ سبز (آزادی کے بعد خوشحالی کی علامت) سرخ و سبز رنگوں کے درمیان تکون میں نیلا آسمانی رنگ (بلوچ سمندر اور وسائل کی علامت) اور نیلے رنگ میں درمیان میں سفید ستارہ تھا۔یہی بیرک آج قومی بیرک کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔جدوجہد کے اس دورانیہ میں 2001ء میں با قاعدہ صلاح و مشورہ اور حکمت عملی کے تحت مکران میں بی ایل ایف کی بنیاد واجہ واحد قمبر کی سربراہی میں رکھی گئی۔جو بی ایل اے کی ذیلی تنظیم تھی۔اس تمام دورانیہ میں حیر بیار مری نے یہاں وہاں بھاگ دوڑ کر کے قومی تحریک کیلئے مالی معاونت کی راہیں بنائیں۔اور جس سے قومی تحریک اور تنظیموں کے اخراجات پورے ہونے لگے۔کیا آج اس بات سے ڈاکٹر اللہ نذر اور براہمدغ بگٹی انکار کر سکتے ہیں؟

لیکن بلوچ قوم کی بدقسمتی کہ ہمیشہ سے ان کی قومی تحریک جس انا پرستی اور گروہ بندی کا شکار رہی ہے۔اس بار بھی 2006ء سے وہی کچھ دہرایا جانے لگا۔واجہ واحد قمبر کی گرفتاری اور ڈاکٹر خالد بلوچ کی شہادت کے بعد جب بی ایل ایف کی بھاگ ڈور ڈاکٹر اللہ نذر کے ہاتھ میں آئی۔اور نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت اور ازاں بعد بالاچ خان کی شہادت کے بعد ایک جانب ڈاکٹر اللہ نذر نے اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد کی بنیاد رکھ کر نہ صرف اپنے راستے الگ کرنے شروع کر دیے، بلکہ اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کیلئے گروہیت و علاقائیت کو سوچ کو پروان چڑھایا۔جس نے اس سے قبل بھی بلوچ قومی تشکیل کو نقصان پہنچایا تھا۔اب کی بار مزید انتشار کا باعث بن رہا ہے۔اسی طرح براہمدغ بگٹی نے بھی اپنے راستے الگ کرتے ہوئے بی آر اے اور بی آر پی کی بنیاد رکھ دی۔اور گروہیت و قبائلیت کی سوچ کو ہوا دی۔اور پھر ڈاکٹر اللہ نذر سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس قومی بیرک کو جسے بی ایل اے نے متعارف کروایا تھا۔اور ازاں بعد

جب قومی بیرک کے طور پر بلوچ قوم نے اسے اپنایا تھا۔ تو بی ایل اے نے اس قومی فیصلے کو قبول کرلیا تھا۔ لیکن براہمدغ بگٹی نے اس قومی بیرک کو بڑی ڈھٹائی سے اپنی پارٹی بی آر پی کا بیرک بنالیا۔ حالانکہ اس سے قبل بی آر پی کے بیرک کا اوپر والا رنگ سبز اور نیچے سرخ تھا۔ اس صورتحال کو سامنے رکھ کر خود بلوچ قوم فیصلہ کرے، کہ حیربیار نے قومی یکجہتی کی جس سوچ کو پروان چڑھایا۔ کیا وہ قومی تحریک کیلئے نقصاندہ ہے؟ یا ڈاکٹر و براہمدغ کی گروہیت وعلاقائیت کی سوچ قومی تحریک کیلئے نقصاندہ ہے؟

میرے خیال میں متوسط طبقے کی موقع پرستی، بلوچ قوم کے لیڈران کی انا پرستانہ سوچ اور ہمسائیہ ملک افغانستان میں عالمی طاقتوں کی برپا جنگ میں "وارلارڈز" کی گروہی و علاقائی رویوں نے بھی اس سلسلے میں بلوچ قومی تحریک پر اثرات مرتب کئے۔

افغانستان میں گروہیت، علاقائیت اور شخصیت پرستی پر مبنی انہی رجحانات و رویوں نے تنازعات کو اتنا شدید کردیا کہ جس کی بناء پر افغانستان تین دھائیوں سے زیادہ عرصے کی اس جنگ میں عدم استحکام کا شکار رہا۔ (یہ رجحانات اور رویے ایک وقت تک عالمی قوتوں کی ضرورت بھی تھے۔) اور افغان ملت وارلارڈز کے رحم وکرم پہ اذیت زدہ زندگی سے دوچار رہے۔ یہ وارلارڈز اپنے گروہی مفادات کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف ودھاک بٹھانے کی خاطر جبر وتشدد کا سہارا لینے کے ساتھ ساتھ منشیات فروشی کے ذریعے ڈالر کماتے رہے۔ اور افغانستان کی آزادی کا خواب ونعرہ دریا برد ہوتا چلا گیا۔ آج بالکل یہی صورتحال ورجحان مکران میں جڑھ پکڑ رہا ہے اور اس رجحان ورویے کو فروغ دینے کیلئے انقلابی روش کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ کل تک مکران میں سرمچاروں کو جس عزت وشرف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آج ان کے کردار پر سوالات اُٹھائے جارہے ہیں۔ کیونکہ آج مکران میں بی ایل ایف کی جانب سے منشیات لوٹ کر فروخت کرنے، گروہیت وشخصیت پرستی کے پیش نظر ڈاکٹر اللہ نذر کی شخصیت کو ابھارنے اور مخبری کے نام پر بےگناہوں کو قتل کرکے لوگوں کے دلوں میں اپنی دھاک بٹھانے کی اودھم نے لوگوں کی زبان پر حرف شکایت کو عام کردیا ہے۔ ڈاکٹر انتونیو گیسٹری "کرائسس ریسرچ سینٹر کا ٹل" میں ریسرچ سکالر ہیں۔ یہ ادارہ افغانستان میں عدم استحکام کی وجوہات کی جانچ پرکھ کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ جہاں نیٹو ممالک کے بعض ملکوں کے سکالرز کے علاوہ افغان طلباء کا ایک گروپ بھی تحقیق کررہے ہیں۔ ڈاکٹر گیسٹری کی رپورٹ کے مطابق "طویل تنازعہ سماج کی تشکیل نو کرتا ہے۔ لیکن اگر اصل مدعا جس کی بنیاد پر تنازعہ شروع کیا گیا ہو، کو نظر انداز کیا جائے، اور مفاد پرستی وگروہیت کو ہوا دی جائے۔ تو وہ وجوہات ہی بدل جاتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر تنازعہ شروع کیا گیا تھا۔ افغانستان میں بھی طویل المعیاد نظریاتی مقاصد کی بجائے، پس پردہ گروہی وعلاقائی سیاسی وسماجی محرکات کو ہوا دی گئی۔ اور افغانستان میں عدم استحکام کو اس بنیادی مقام پر پہنچایا گیا۔ جہاں سے افغان آبادی کے مختلف سیکٹرز نے مختلف علاقائی رجحانات پر خود کو فعال کیا۔ اور اس سے دو سماجی طبقے ابھرے۔ مذہبی وارلارڈز اور فوجی پروفیشنلز۔ جنہیں افغانستان میں "کمانڈرز" کہا جاتا ہے۔ جس کی بناء پر ابھرنے والی خانہ جنگی سے نظریاتی کشمکش اور شدت پسندی کے رجحانات کو تقویت ملی۔ اس طرح یہ جنگ غیر منظم گروہوں کے طاقت کی جنگ بن گئی۔ بین الاقوامی مداخلت کی وجہ سے عالمی قوتوں نے بھی اپنے مفادات کے تحت ان عناصر کی سرپرستی کی۔ اور پھر جنگی گروہ وجنگی سردار افغان ملت کیلئے دردسر بن گئے۔ اور افغانستان میں کرائے کے سپاہیوں کیلئے راہ ہموار ہوگئی۔"

(واضح رہے کہ امریکہ نے 2001ء کے بعد افغانستان میں براجمان ہونے کے بعد وارلارڈز کی اس طرز عمل کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا۔ تب کہیں جاکر افغانستان میں جنگ پر کافی حد تک قابو پالیا گیا۔) آج بلوچ وپنجابی تنازعہ کو شدید تر بنا کر بلوچ قومی آزادی کی جہد کو منظم انداز میں وسعت دینے کی بجائے، بی ایل ایف وبی آر اے شخصیت پرستی، گروہیت اور علاقائیت کے سیاسی رویوں کو ہوا دینے کے ساتھ ڈاکٹر اللہ نذر کو وارلارڈ ثابت کرنے کیلئے خوف وہراس کی ایک فضاء پیدا کرنے کی تگ ودو میں ہیں۔ ان کا یہ رویہ ورجحان بلوچ قومی تحریک کیلئے انتہائی نقصاندہ ہے۔

انسانی زندگی کی تعمیر، سماجی تبدیلی، انقلاب اور قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیاد فکر ومقصد پہ رکھی جاتی ہے۔ یہ فکر ومقصد اس وقت سماجی تبدیلی، انقلاب اور قومی آزادی کا روپ دھار سکتا ہے۔ جب سچی لگن کے ساتھ فکر ومقصد کو عمل سے مربوط کیا جاتا ہے

بی ایل ایف، بی این ایم، بی ایس او آزاد اور بی آر پی کے پلیٹ فارم سے خود تنقیدی اور محاسبہ کے ذریعے غلط رجحانات کی روک تھام تو دور کی بات، سوال اُٹھانے اور حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے رد انقلابی رویوں کو اجاگر کرنے پر ڈکٹیٹرانہ انداز اختیار کرکے بجنبش یک قلم کارکنان کے خلاف نہ صرف تادیبی کاروائی ان کا معمول ہے، بلکہ ان کی پالیسیوں اور ان کے رویوں کے حوالے سے سوالات کرنے اور حقائق کو سامنے لانے والوں کو مدلل انداز میں جواب دینے کی بجائے ان پر سوشل میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں گالی گلوچ اور الزامات کی بوچھاڑ کردی جاتی ہے۔ داناؤں کا قول ہے۔ "جہاں دلائل وحقائق کی حد ختم ہوتی ہے، وہاں سے گالی گلوچ کا آغاز ہوتا ہے۔" کیا ان رویوں کے ساتھ بی ایل ایف کی قیادت قومی تحریک کیلئے سودمند وفائدہ مند کہلانے کا مستحق ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

قانون یا قانون دان بذات خود کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتے، وہ لوگوں کے جدو جہد کا نعم البدل نہیں بن سکتے
جب تک کہ کوئی تحریک اپنے بام عروج تک نہیں پہنچتی تب تک اس مسئلے کو عالمی عدالتِ انصاف میں پیش نہیں کیا جاسکتا

جان فرمن
بیلجیئن وکیل اینڈ انٹرنیشنل ایسوسیشن آف ڈیموکریٹک لائرز کے ڈپٹی پریزیڈنٹ
انٹرویو: فیض محمد بلوچ

ہمگام۔ استحصال زدہ اقوام کی مدد کیلئے آپکی ایسوسیشن اور یورپی وکلاء کیا کردار ادا کرسکتے ہیں؟

جان فرمن: جب بھی مجھ سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے جو آپ نے پوچھا ہے تو میرے ذہن میں یہ مسئلہ آجاتا ہے کہ آخر ہم یا وکلاء کیا کر سکتے ہیں؟ مجھے یہ امر کچھ پریشان کر دیتا ہے کہ لوگ شاید قانون اور وکلاء کے کردار کا بہت زیادہ اندازہ لگا لیتے ہیں کیونکہ میرے خیال میں وکیل کسی بھی سماجی آزادی قومی آزادی یا نجات کے تحریک کی صرف قانونی مدد کر سکتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب وہ کسی حملے کے مسلسل زد میں ہوں تب ہم کسی استحصال زدہ قوم کو قانون کے چھتری تلے تحفظ دینے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں، ہم قانونی چارہ جوئی کیلئے بھی مدد کر سکتے ہیں لیکن قانون یا قانون دان بذات خود کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتے، وہ لوگوں کے جدو جہد کا نعم البدل نہیں بن سکتے ۔یہاں میں یاد آوری کیلئے ایک اہم بات کرنا چاہوں گا کہ اکثر ہمارے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جو ریاستی بربریت اور انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کے شکار ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ ان کے مسئلے کو عالمی عدالتِ انصاف لیجایا جائے، لیکن یہ ممکنات میں شامل نہیں کیونکہ جب تک کہ کوئی تحریک اپنے بام عروج تک نہیں پہنچتی تب تک اس مسئلے کو عالمی عدالتِ انصاف میں پیش نہیں کیا جاسکتا، اس کے بعد میں پھر آپ کے ہی بنیادی سوال پر آوں گا کہ ہم آپ کے تحریک کی مدد کرنے کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟

ہمگام: بلوچستان میں آج تحریک آزادی اپنے عروج پر ھے یھی وجه ھے که آج قابض ریاست ھیجان کا شکا ر ھوچکا ھے ، اس لئے آج ریاست وھاں ان وکلاء کومارر ھاھے جو لاپته افراد کے کیسوں کو چلاتے ھیں ، وہ ان بلوچ طلباء اور اساتذہ کو مارتے ھیں جو بلوچ حقوق کیلئے اپنی آواز بلند کرتے ھیں۔ حال ھی میں انھوں نے یونیورسٹیوں اور کالجوں پر چھاپے مار کر بلوچ طلباء کے ان کتابوں کو ضبط کرلیا جو گاندھی ، نھرو اور دوسرے سماجی تحریکوں کے بارے میں تھیں ، وھاں بلوچ ادب ، زبان اور تاریخ کے کتابوں کو بھی نھیں بخشا گیا ، وھاں اب لوگ ان مظالم کیخلاف مسلح اور غیر مسلح سیاسی مزاحمت کر رھے ھیں ، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ھے ؟

جان فرمن: میرے خیال میں اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ آپ اپنے تحریک کو عالمی سطح پر کس طرح کا اظہار دینا چاہتے ہیں؟ میں یہاں آپ کو کچھ مثالیں دینا چاہوں گا کہ ہم کس طرح کا کام کرتے ہیں۔ فلپائن میں ایک انقلابی تحریک 90 کے دہائی کے اوائل سے چل رہی ہے، وہ ساتھ میں حکومت سے مذاکرات بھی کر رہے ہیں۔ جب مذاکرات کا آغاز ہوا تو حکام یہ سوچ رہے تھے کہ وہ بھی اس تحریک سے ال سلواڈور کی

تحریک کےطرز پر نمٹیں گے کہ وہ بہت جلد اس تحریک کو ختم کرکے اس سے نجات حاصل کرلیں گے، لیکن یہ خام خیالی ثابت ہوا کیونکہ فلپائن میں انقلابیوں نے مذاکرات کا

اس کے بعد ہم انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف ڈیموکریٹک لائرز کے ذریعے انقلابیوں کیلئے ایک سپورٹ گروپ اور قانونی ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دینے میں کامیاب

بلوچ معروضی حالات کے بارے میں ہم سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں۔میں پھر آپ کے سوال پر آوں گا کہ کیا وہاں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجی جاسکتی ہے؟ یہاں پھر دو باتیں انتہائی اہمیت کا حامل ہونگے پہلی کہ کیا فیکٹ فائنڈنگ مشن کا دورہ ثمر حاصل ہوسکتا ہے؟ اور دوسری کیا وہاں لوگوں کا تحفظ ممکن بنایا جاسکتا ہے؟ پھر میرا جواب ہوگا ہاں، ہم بلوچستان ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیج سکتے ہیں۔

استعمال صرف اپنے تحریک کو منظم کرنے کیلئے کیا۔وہاں مسئلہ یہ تھا کہ حکام کسی بھی راضی نامے پر آمادہ تھے، اور کسی بھی کاغذ پر دستخط کرنے پر تیار تھے، انہوں نے حامی بھی بھرلی کہ وہ لینڈ ریفارمز سمیت تمام سماجی مسئلوں کو حل کریں گے، بادی النظر میں انہوں نے ہر چیز پر دستخط کرلیئے کیونکہ انہوں نے یہ سوچا تھا کہ راضی نامہ کرنے کے بعد جب تین چار مہینے گذر جائیں گے تو وہ ان کاغذات کو پھاڑ کر کسی کوڑے میں پھینک دیں گے اور تحریک کے خاتمے کے بعد جو ان کا دل چاہے گا کریں گے۔وہاں حکام اور انقلابیوں کے بیچ پہلے مرحلے میں امن کے قیام پر بہت سے نقاط پر اتفاق اور دستخط ہوئے۔ان سب کا ایک بہت ہی دلچسپ پہلو ہے مثال کے طور پر اس راضی نامے کی ایک جامع شق انسانی حقوق اور عالمی انسانی قوانین کے احترام کے بارے میں تھا۔جس میں دونوں فریقوں نے یہ حامی بھری تھی کہ دونوں طرف سے کوئی بھی اگر انسانی حقوق کے خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تو اسے از خود سزا دی جائے گی جس کے معنی میں صرف فلپینی حکومت مضمر ہے اور دوسری طرف دیکھا جائے حکام نے اس شق پر دستخط کرکے انقلابیوں کو دوسری طاقت کے حیثیت سے تسلیم کرلی کیونکہ اگر آپ کسی مذاکرات میں یہ کہیں کہ آپ کے فریق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی کا بھی فیصلہ کرسکتا ہے اور سزا دے سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے ایک ریاست کے حیثیت سے تسلیم کر رہے ہیں اور آپ اس کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں۔

آگے جاکر ایک ایسا مقام آیا کہ حکومت اپنے موقف سے بالکل ہٹ گئی اور کسی بھی پرانے راضی نامے کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ انقلابیوں کی تحریک ایک دہشت گردانہ تحریک ہے۔اب کیونکہ فلپینی حکومت انقلابیوں کی طاقت تسلیم کرچکی تھی تو انقلابیوں نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہم تو مذاکرات اور عالمی ثالثی پر ہی زور دیتے رہیں گے اور اس راضی نامے سے ہی جڑے رہیں گے، انہوں نے کہا کہ ہم عالمی قوانین کے مطابق ہی عمل کرتے رہیں گے، فلپائنی سماج کے حوالے سے حکومت اور انقلابیوں کے نقطہ نظر میں ایک واضح فرق ہے لیکن ہم دونوں عالمی قوانین کے ماتحت ہیں کیونکہ کم از کم یہ ہم دونوں کیلئے واحد مشترک میدان ہے جہاں ہم بیٹھ سکتے ہیں۔ اس طرح وہ عالمی طور پر اپنے تحریک کا ایک اچھا چہرہ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ہوئے۔اب صورتحال یہ بن گئی کہ عالمی ماہر قانون انقلابیوں (نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ) کو فلپائن کے مسئلے کے بابت عالمی قوانین پر مشورہ دیتے ہیں۔حال ہی میں نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کو اقوام متحدہ نے اپنے کمسن سپاہی Child soldiers کے لسٹ میں شامل کردیا۔یہ ایک خاص لسٹ ہے جس میں ان مسلح تحریکوں کے نام شامل کیئے جاتے ہیں جو جنگ میں کمسن بچوں کو بطور سپاہی استعمال کرتے ہیں۔حالانکہ یہ بات سچ نہیں تھی۔اس مسئلے پر UNICEF کی ایک جامع رپورٹ بھی ہے جو فلپائن کے حالات کا احاطہ کرتا ہے، اس میں گہرائی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کے بعد کہا گیا ہے کہ فلپائن کے انقلابی تحریک میں کمسن سپاہی Child soldiers استعمال نہیں ہو رہے۔بہرحال ان کا نام اس لسٹ میں ڈالنے کے پیچھے کچھ سیاسی محرکات اور امریکی دباو تھا۔اس کے ردعمل میں نیشنل ڈیموکریٹک نے باقاعدہ عملی اقدامات اٹھائے اور اپنے تحریک میں بچوں کے حفاظت کیلئے کئی باڈیز تشکیل دیں۔یہ عمل عالمی قوانین کے عین مطابق ردعمل تھا، ہم نے اس پر کام کیا۔یہ تمام ایسی معاونتیں ہیں کہ ہم کسی تحریک کے ساتھ کرسکتے ہیں، اب جیسا کہ آپ کو پتہ ہے کہ آجکل کولمبیا میں امن مذاکرات چل رہے ہیں۔ہم نے وہاں بھی اسی طرز کی ایک قانونی ماہرین کی ٹیم تشکیل دی ہے۔جو کولمبیا میں باغیوں کی مذاکرات کے دوران مدد کرے گی۔ہم نے کئی بار کوشش کی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو قومی دائرہ اختیار سے نکال کر یورپ کے اندر عالمی دائرہ اختیار میں لائیں۔یہاں اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ عوامل ہمیشہ معاون ثابت ہوتے ہیں جہاں ان تحریکوں کے ضروریات پر گفتگو ہوتی ہے لیکن اس کا فیصلہ ہمیشہ تحریک کو از خود کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس کو کیسے آگے لیجانا چاہتے ہیں ہم صرف بعدازاں معاونت کرسکتے ہیں اور اس کو اپنے فورم سے دنیا کے سامنے ظاہر کرتے ہیں۔

ھمگام ۔:بلوچ تحریک ایک قومی آزادی کی تحریک ھے، وہ آزادی کیلئے جدوجھد کررھے ھیں۔شاید آپ کے علم میں ھو کہ بلوچستان ایک آزاد ملک تھا

لیکن اس پر قبضه کرکے اسے تقسیم کیا گیا ، اس کے بعد سے ابتك بلوچ دوبارہ اپنے آزادی کے حصول کیلئے جدو جهد کررهے هیں، لیکن اس کے باوجود بلوچ تحریك عالمی طور پر پذیرائی حاصل نهیں کر رهی هے حتیٰ کے پاکستانی علاقائی میڈیا بھی اسے یکسرنظر انداز کر رها هے، اس لیئے بلوچستان میں بلوچوں کا لاپته هونا شهید هونا نظر انداز هورها هے۔ اگر ان حالات میں بلوچ تحریك کی لیڈر شپ آپ تك رسائی حاصل کرکے یه مطالبه کرے که بلوچستان ایك فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجا جائے تو کیا یه ممکن هے ؟

جان فرمن : ہاں بالکل اس پر غور کیا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھار فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجنا ممکن ہے اور کبھی کبھار بہت ہی مشکل، کیونکہ متاثرہ علاقوں میں نو گو ایریاز ہو سکتے ہیں، ایسے عالم میں مشن بھیجنے کا مطلب مقامی لوگوں کی جانیں خطرے میں ڈالنا ہوتا ہے، اس کا ہم ماضی میں مشاہدہ کر چکے ہیں کہ جب فیکٹ فائنڈنگ مشن کسی علاقے کا دورہ کرکے واپس آجاتے ہیں تو ان کے دورے کے بعد مذکورہ علاقوں کے لوگ مکمل طور پر ریاست کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں جن کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان سب سوالوں اور تحفظات کے باوجود میں کہوں گا ممکنات اور ناممکنات کے بابت بہترین فیصلہ صرف تحریک از خود کر سکتی ہے، کیونکہ آپ (بلوچ) معروضی حالات کے بارے میں ہم سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں۔ میں پھر آپ کے سوال پر آوں گا کہ کیا وہاں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجی جا سکتی ہے؟ یہاں پھر دو باتیں انتہائی اہمیت کا حامل ہونگے پہلی کہ کیا فیکٹ فائنڈنگ مشن کا دورہ ثمر حاصل ہو سکتا ہے؟ اور دوسری کیا وہاں لوگوں کا تحفظ ممکن بنایا جا سکتا ہے ؟ پھر میرا جواب ہوگا ہاں، ہم بلوچستان ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیج سکتے ہیں۔

> مجھے لگتا ہے آپ کو بلوچ تحریک کے لیڈروں سے اس مسئلے پر بات کرنی چاہئے اور اپنے ضروریات وتقاضوں کا تعین کرنی چاہئے۔اس کے بعد جب آپ کو لگا کہ یہی آپ کی ضرورت ہے اور ممکن ہے تو پھر ہم اس پر بات کر سکتے ہیں

ہمگام۔ یهاں بھی بهت سے تحقیقاتی کمیشن قائم کی گئی هیں، ان سب کی سربراهی آرمی کے خفیه اداروں کے نمائیندے کرتے رهے هیں وهی آرمی جو خود لوگوں کے جبری گمشدگیوں میں ملوث هے ، اسی لیئے یقینا انهیں کوئی ثبوت بھی نهیں ملا۔ اسی لیئے هم عرصه دراز سے ایك عالمی تحقیقاتی کمیٹی کا مطالبه کرتے آرهے هیں ، اگر بلوچ تحریك میں مصروفِ عمل بلوچ تنظیمیں آپ سے رابطه کر کے یه اپیل کرتے هیں که بلوچستان ایك فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجا جائے تو کیا آپ اس سلسلے میں مدد کرسکتے هیں ؟

جان فرمن : جی ہاں، یہ ایسا کام ہے جو ہم پہلے بھی کر چکے ہیں خاص طور پر فلپائن میں جب کچھ سال پہلے ڈیتھ اسکواڈز کافی متحرک تھے۔ ہم نے وہاں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجی کیونکہ بہت سے ایسے وکلاء جن سے ہماری آشنائی تھی وہ شدید خطرے میں تھے، ہم نے فیصلے کیا کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ اس طرح کے تمام امور سرانجام دینا ہمارے لیئے ممکنات میں شامل ہیں۔ اس لیئے ہم نے ایک بار پھر فلپائینیوں کی مدد کی، میں اس بارے میں کافی آگاہی رکھتا ہوں کیونکہ میں بذاتِ خود ہالینڈ میں اسی طرز کے ایک ٹریبونل کا حصہ رہا ہوں۔ گو کہ وہ مختلف نوعیت کی تھیں لیکن بنیادی طور پر یہ کسی بھی تحریک پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ وہاں کس طرز کا ٹریبونل تشکیل دی جائے۔ جب ہم نے فلپائین کے مسئلے پر ٹریبونل تشکیل دی تو ایک ایسا مقام آیا کہ ہم یہ مشورہ کرنے لگے کہ فلپائن میں تو انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بام عروج پر ہیں آخر ہم ان خلاف ورزیوں کو دنیا کے سامنے کیسے عیاں کریں؟ اس وقت فلپائنیوں نے ہم سے کہا کہ کیوں نا اس ٹریبونل کو ہالینڈ میں تشکیل دیں اور فلپائن میں ہماری بہت سی

تنظیمیں ہیں جو وہاں سے ثبوت اور گواہان جمع کر کے اس کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ہمگام۔**یہی صورتحال آج بلوچستان کی بھی ھے ،جیسا کہ میں نے کھا کہ میڈیا اور عالمی برادری کے نظر انداز کیئے جانے کی وجہ سے وھاں کی حالت زار سے کوئی واقف نھیں۔**

جان فرمن: لیکن یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا آپ کی تحریک اس سطح تک پہنچ چکی ہے؟ مثال کے طور پر فلپائین کے مسئلے پر ٹربیونل تشکیل دینے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ انہوں نے تمام ثبوت جمع کیئے ہوئے تھے،انہوں نے اپنے مسئلے پہ ماہرین کی رائے لی ہوئی تھی انہوں نے تمام پہلووں پہ کام کیا ہوا تھا اور بعد انہوں نے ان سب کو اکھٹا کر کے وکیلوں کی مدد سے ٹربیونل کے سامنے پیش کیا،لیکن اس میں میرے خیال میں انہوں ایک سال سے زائد کا عرصہ لگا انہوں نے محنت کی آخر یہ کام انہیں ہی کرنا تھا ۔ان کے لوگوں نے گواہان کے وڈیو بیانات اکھٹے کیئے انہوں نے اپنے لوگوں کو قائل کیا کہ وہ اس ٹربیونل میں شرکت کریں،انہوں نے فنڈز اکھٹا کر کے ان متاثرہ لوگوں کو ہالینڈ لا کر انہیں ٹربیونل کے سامنے پیش کیا اور بہت سوں کو منیلا سے وڈیو لنک کے ذریعے بیانات قلمبند کروائے ۔اصل اور ضروری کام یہی ہیں جو آپ کو اپنے زمین پہ کرنی ہوتی ہیں۔ہوسکتا ہے کہ یہ طریقہ کار بہت سے تحریکوں کیلئے سودمند ثابت ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت سی تحریکیں اس سے کما حقہ فائدہ نا اٹھا پائیں ۔تو میرے خیال میں یہاں اور بہت سے ممکنات ہیں جن کیلئے کوشش کی جا سکتی ہے جیسے کہ انکوائری کمیشن ،عوامی ٹربیونل، رائے دہی کے ٹربیونل،فیکٹ فائنڈنگ مشن، کورٹوں میں کیس ٹرائلز اس کے علاوہ اور بہت سے طریقے۔

ہمگام۔:**یقینا بلوچستان میں فیکٹ فائنڈنگ مشن کو تحریك کی طرف سے کوئی نقصان یا خطرے کا سامنا نھیں ھوگا لیکن حکومت کی ضمانت کوئی نھیں دے سکتا ۔ میرے خیال میں وہ کسی بھی فارن مشن کو نقصان دینے سے دریغ نھیں کریں گے کیونکہ وہ چاھتے ھیں کہ کسی طور بلوچ تحریك کو بد نام کرکے اس ریاستی جارحیت کو دنیا کے نظروں سے چھپایا جائے ۔**

جان فرمن: ہاں میں جانتا ہوں اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے، مجھے لگتا ہے آپ کو بلوچ تحریک کے لیڈروں سے اس مسئلے پہ بات کرنی چاہئے اور اپنے ضروریات و تقاضوں کا تعین کرنی چاہئے ۔اس کے بعد جب آپ کو لگا کہ یہی آپ کی ضرورت ہے اور ممکن ہے تو پھر ہم اس پہ بات کر سکتے ہیں ۔ہاں تب تک (ہنستے ہوئے) جب تک کہ آپ کو یہ نہیں لگے کہ کہیں عالمی عدالت انصاف آ کر آپ کو آزادی دے گی ۔

ہمگام۔**میں آپکا انتہائی شکر گذار ھوں ، آپکی باتیں ھماری لیئے مددگار ثابت ھونگی**

جان فرمن: شکریہ

☆☆☆☆☆☆☆☆

بلوچستان میں پاکستان کی جنگی جرائم

حمل بلوچ

تاریخ عالم بتادیتی ہے کہ ریاستوں کے مابین حیوانی جبلت ہو توسیع پسندانہ عزائم، احساس برتری اور وسیع مفادات کے حصول نے تضادات اور چپقلش کو جنم دے کر جنگ کی صورت حال پیدا کی ہے جس سے ریاستیں آپس میں لڑ پڑے۔اور انسانی جانوں کے ضیاع اور بحران بتدریج جاری ہو کر ایک المناک کیفیت سے دوچار رہوا جس سے انسانی جانوں کی تباہیوں کا نہ روکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا، دونوں عالمی جنگوں نے کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، دنیا کی ترقی کی رفتار سست روی کا شکار ہوگئی قحط، بھوک اور افلاس نے جنم لے لیا، معاشی پسماندگی، تعلیم اور صحت کے مسائل پیدا ہوگئے، لیگ آف نیشن کی ناکامی کے بعد اس انسانی زوال اور بحران کے وجوہات اور محرکات نے دنیا کو مجبور کردیا کہ وہ ایسا بین الاقوامی تنظیم کا قیام وجود میں لائے جس سے عالمی امن وسلامتی کو یقینی بنانا ممکن ہوں اور انسان وحشی پن، سفاکیت اور جنگی ماحول سے دور ہوکر پر امن اور باوقار ماحول میں زندگی بسر کرے۔جس سے انسانوں کی آزادی، جان ومال کی تحفظ، فلاح وبہبود، صحت، تعلیمی معیار کی بہتری ،معاشی خوشحالی اور ترقی یقینی ہوں، آخرکار 24اکتوبر 1945 کو اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور رکن ممالک کو پابند کیا گیا کہ وہ اقوام متحدہ کی چارٹر پر عمل کرکے جنگوں سے دور رہیں اور اپنے شہریوں کو ان تمام بنیادی حقوق مہیا کریں جو اقوام متحدہ کی چارٹر میں شامل ہیں، اور یہ ہدایات کی گئی کہ اگر کوئی ریاست اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کرکے جنگی جرائم میں ملوث پایا جاتا ہے تو اس کے خلاف باقاعدہ بین الاقوامی قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔جب جرمنی جنگی جرائم میں ملوث پایہ گیا تھا تو اس کے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا جنگی جرائم کے مشہور مقدمات (نیورمبرگ مقدمہ)(the Nuremberg Trial کے جرمنی کے 22نازی رہنماوں اور چھ انجمنوں کے خلاف جرائم جنگی قواعد کی خلاف ورزی اور انسانیت کے خلاف جرائم کے تحت مقدمات چلائے گئے ۔اکتوبر 1946 کو عدالت نے اپنا فیصلہ سنادیا، عدالت نے تین نازی رہنما رہا کردیے بارہ کو سزائے موت سنائی گئی تین کو عمر قید کی سزا ملی اور باقیوں کو مختلف سزائیں ہوئیں چھ میں سے تین انجمنوں کو عدالت نے مجرم ٹھرادیا۔

اسی طرح دوسرا مشہور مقدمہ (ٹوکیو مقدمہ)(The Tokyo Trial) جاپان کے خلاف بھی چلایا گیا تھا کیونکہ جاپان بھی جنگی جرائم میں ملوث پایہ گیا تھا، عدالت نے نومبر 1948 کو فیصلہ سنایا اور مجرموں کو ان کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے سزائے موت اور قید کی سزائیں سنائی کیونکہ جاپان نے نہ صرف جرمنی اور اٹلی کا ساتھ دیا تھا بلکہ بین الاقوامی قواعد وضوابط کی بھی خلاف ورزی کی گئی تھی ۔نیومبرگ اور ٹوکیو عدالتوں نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ حملہ سے کی جانے والی جنگ بین الاقوامی عہدناموں کی خلاف ورزی غیر قانونی تصور کی جائے گی ۔جب کوئی ریاست کسی دوسری ریاست کی علاقائی و جغرافیائی سالمیت کے خلاف کاروائی کرتی ہے تو یہ حملہ تصور کیا جائے گا کسی بھی ریاست کی حملہ غیر قانونی ہوگا، اگر آج دیکھا جائے تو پاکستان نے اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر بلوچستان کی علاقائی وجغرافیائی سالمیت کے خلاف فوجی کاروئی کرکے بلوچستان پر قابض ہوگیا ہے، پاکستان کی بلوچستان پر کاروائی حملے کے زمرے میں آتا ہے جو کہ نیومبرگ ورٹوکیو عدالتوں کے تناظر میں بین الاقوامی عہدناموں کی خلاف ورزی اور غیر قانونی ہے، دوسری بات اگر کوئی ملک اپنے دفاع میں دوسرے ملک کے حملے کا مقابلہ کررہا ہے تو اس کا یہ دفاع نہ ہی غیر قانونی ہوگا اور نہ ہی حملے کا ذمہ دار ہوگا ، کیونکہ اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 51 کے تحت تمام ریاستوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی قسم کے مسلح حملے کے خلاف اپنے دفاع کے لئے مقابلہ کریں ۔آج بلوچ مسلح تنظیمیں اپنی دفاع کے لئے پاکستانی فوج کے ناجائز قبضہ گیری اور ظلم کے خلاف لڑ رہے ہیں جبکہ دوسری جانب پاکستانی فوج بلوچوں پر سفاکانہ اور وحشیانہ حملے کرکے بین الاقوامی عہدناموں کو بڑی بدمعاشی سے توڑ رہا ہے، جو کہ براہ راست جنگی جرائم میں ملوث ہو پا رہا ہے۔جنگی قوانین کے عہدناموں کے چھ اصول کو مختصر واضح کرتے ہیں تاکہ قارئین کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوں ۔زمینی جنگ کے معلق قانون اور قاعدہ 1907 کے ہیگ کنونشن میں قوائد وضوابط اس لئے واضح کیے گئے تاکہ مہذب دنیا جنگ وجدل کے دوران بھی تہذیب وتمدن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، لیکن یہاں پاکستان تہذیب وتمدن سے کوسوں دور طاقت کے نشے میں بربریت اور سفاکیت کا ایسا پیمانہ اور درندگی سے بلوچوں پر اترا ہے تاریخ میں شائد جسکی مثال بہت کم ہوں، ہیگ کنونشن نے کچھ اس طرح قواعد پیش کیے ہیں،

1 ۔زمینی جنگ میں ایسے مہلک ہتھیار مثلا زہریلی گیس، زہریلے ہتھیار اور زہریلی گولیاں وغیرہ کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے، ایسے ہتھیاروں کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے جن کے اثرات کی وجہ سے سسک سسک کر انسانی موت واقع ہو،

جبکہ پاکستان یہاں زمینی جنگ کے قوائد وضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی کررہا ہے کیونکہ پاکستان بلوچوں پر مہلک ہتھیار، زہریلی گیس اور زہریلے ہتھیار کا کھلے عام

استعمال کررہا، جو کہ ہیگ کنونشن کی مکمل خلاف ورزی ہے۔

2۔ہتھیار ڈال دینے والے دشمن کو قتل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

جب تربت میں ایوب جان گچکی کے گھر کا پاکستانی فوج نے محاصرہ کر کے بمباری شروع کیا تو وہاں گھر میں موجود مسلح افراد زبیر جان گچکی ،مراد جان گچکی اور جمل نے اپنے دیگر دو ہمراہ کے ساتھ ہتھیار ڈال کر (Surrender) اپنی گرفتاری کے لئے اپنے آپ کو فوج کے حوالے کرنے کی کوشش کی لیکن فوج بجائے ان کو گرفتار کر لیتی ان پر اندھادھند فائرنگ کر کے بے دردی سے شہید کیا گیا اور ہیگ کنونشن کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

3۔ہیگ کنونشن کی دفعہ تین 3 کے تحت یہ اصول طے پا گیا تھا کہ اگر کوئی مخالف ریاست جنگی قوانین کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی ہے تو اس ریاست کو ان تمام اقدامات کا تاوان ادا کرنا پڑے گا جو اس ریاست کی فوجی طاقتوں نے اس کے ایماء پر کئے ہیں۔جبکہ پاکستان براہ راست ان تمام جنگی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے اور کنونشن کی دفعہ تین کے تحت پاکستان کو ان تمام نقصانات کا تاوان دینا چاہئے جو 65 سالوں سے بلوچوں کی نسل کشی پر تلا ہوا ہے۔قیدیوں کے متعلق 1949 ء کو جینوا کنونشن میں مزید قواعد و ضوابط کا اضافہ کیا گیا ریاستوں کو سخت پابند کی گئی کہ وہ حراست میں لینے والے قیدیوں سے جینوا کنونشن کے اصولوں سے پیش آئیں تا کہ کنونشن کے اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو کنونشن کے اصول کچھ اس طرح ہیں۔

1۔قیدیوں سے انسانی سلوک کرے۔

2۔غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک سے باز رہے۔

3۔معلومات حاصل کرتے وقت انہیں غیر انسانی جسمانی سزا نہ دے۔

4۔قیدیوں کی حیثیت کے مطابق سلوک کرے۔

آج اگر پاکستانی فوج کے وحشیانہ اور ظالمانہ حرکات کو باریک بینی سے پرکھا جائے تو آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ پاکستانی فوج جینوا کنونشن کے قواعد و ضوابط کی کتنی پاسداری کر رہا ہے، بالکل واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ پاکستانی فوج کھلے عام اپنے سنگین جرائم کا اعتراف تفاخر سے کر رہا ہے کہ ہم ایسا ہٹ کرینگے پتہ تک نہیں چلے گا بالکل آج اسی تسلسل کے ساتھ ہم بلوچوں کو ہٹ کر رہا ہے یہ الفاظ پاکستانی فوج کے سابقہ چیف آف آرمی اور سابقہ صدر پرویز مشرف کے آن دی ریکارڈ موجود ہیں، جب پاکستانی فوج کسی بے گناہ بلوچ شہری کو پکڑتا یا اغوا کرتا ہے تو اس پر بدترین انسانیت سوز تشدد کرتا ہے، معلومات حاصل کرتے وقت ان کے جسم کو چیر چیر کر اپنی درندگی کا ثبوت دیتا ہے، دوران حراست ان پر سفاکانہ تشدد سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔بعد میں اس کی لاش کو مسخ کر کے پھینک دیتی ہے تا کہ شناخت کے قابل نہ رہے۔جینوا کنونشن کے اصولوں کی خلاف ورزی پر پاکستان کے خلاف ان تمام عالمی عہدناموں کے تحت عالمی قوانین کے مطابق بلوچوں پر پاکستانی بربریت کے خلاف باز پرس کو یقینی بنانا اور سزا کا تعین ان تمام بین الاقوامی پاسداران کی قانونی ذمہ داری بنتی ہے، کہ وہ پاکستان کو بلوچوں پر ایسے مظالم اور جرائم کرنے سے روکیں۔

کنونشن کی دفعہ 36 طبی امدادی گاڑیوں اور ہوائی جہازوں پر زخمیوں اور بیماریوں کی نقل وحمل کی حفاظت اور ضمانت فراہم کرتی ہے، جبکہ دوسری جانب پاکستانی فوج اور خفیہ ایجنسیاں گاڑیوں میں سوار و اسپتالوں سے زیر علاج بلوچ زخمی یا بیمار سپاہیوں یا عام بلوچ کو گھروں سے اٹھا کر اپنے ٹارچر سیلوں میں ان پر جسمانی تشدد کرنے کے بعد اس کی لاش کو مسخ کر کے پھینک دیتی ہے۔پاکستان کی یہ غیر انسانی عمل کنونشن کی دفعہ 36 کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے، جو پاکستان کو اس کے یہ غیر انسانی حرکات میں ملوث ہونے کی وجہ سے براہ راست جنگی جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔کنونشن کی دفعہ 15 اور 16 جاں بحق ہونے والے سپاہیوں کی لاشوں سے سلوک سے متعلق واضح کرتی ہے، اس دفعہ کے تحت حریبوں پر پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ جلد مرنے والوں کے نام و نشان اور دیگر اشیاء جو ان سے حاصل کئے گئے ہیں واپس کرنے کے انتظامات کو فی الفور یقینی بنائیں، جب کہ یہاں پاکستان کی جانب سے مرنے والے سپاہی اور بے گناہ مرنے والے بلوچوں کے نام و نشان اور ان سے اشیاء حاصل کئے گئے واپسی کے انتظامات اپنی جگہ پاکستان ان کے چہروں کو چونا لگا کر ان کو اجتماعی طور پر ایسے زمین میں دفنا دیتا ہے تا کہ ان کے شناخت ممکن نہ ہو اس کی ایک بڑی واضح مثال خضدار کے شہر توتک میں اجتماعی قبروں سے 169 لاشوں کی برآمدگی ہے جو کوئی لاش سوائے دو کے شناخت کے قابل نہیں رہے، اس کے علاوہ خفیہ اداروں کی جانب سے اغوا کئے گئے بلوچوں کی اجتماعی قبریں بلوچستان کے دیگر شہروں میں وقتاً فوقتاً دریافت ہو رہے ہیں جو کوئی شناخت کے قابل نہیں ہو رہا ہے، یقیناً جینوا کنونشن کی دفعہ 15 اور 16 کے تحت پاکستانی فوج اور اس کے خفیہ اداروں کے اہلکار کنونشن کی اس دفعہ کے سنگین خلاف ورزیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔اسی طرح پاکستان بھی فضائی جنگ کے عالمی کانفرنسوں کے مرتب کے گئے اصولوں کی خلاف ورزیوں پر جنگی جرائم میں ملوث ہو رہا ہے کانفرنسوں کے اصولوں کی مختصر وضاحت کچھ اس طرح ہیں۔

1۔شہریوں کو ہلاک کرنے ان کی املاک کو تباہ کرنے یا غیر فوجیوں کو زخمی کرنے کے لئے بمباری کی ممانعت ہوگی۔

2۔زمینی افواج کی کاروائی پر بمباری کی ممانعت ہوگی۔

3۔قانونی بمباری وہی کہلائے گی جو فوجی اہمیت کے مقامات تباہ کرنے کے لئے ہو مثلاً فوجی اڈے، اسلحہ ساز فیکٹریاں اور فوجی مواصلات کے نظام کی تباہی کے لئے کی گئی ہو بمباری ہی قانونی بمباری کہلائے گی۔

4۔فوجی مقاصد کے پیش نظر ایسی بمباری کی بھی ممانعت ہوگی جس سے شہری آبادی کی تباہی یقینی ہو تو ایسی بمباری کی بھی ممانعت ہوگی۔

5۔ایسے تمام جنگی قوانین جو زمینی اور غیر جانب داروں پر لاگو ہوتے ہیں وہ فضائی

جنگ کی قانون اور غیر قانونی حیثیت کے متعلق گروشش Grotious اپنی کتاب ،،امن اور جنگ،، میں یوں لکھتا ہے کہ انصاف پر جنگ قانونی ہے اور نا انصافی پرمبنی جنگ غیر قانونی ہے، آج ہماری جنگ بھی قانون اور انصاف پرمبنی ہے جبکہ پاکستانی جنگ غیر قانونی اور نا انصافی پرمبنی ہے، کیونکہ پاکستان نے بلوچستان پر قبضہ کیا ہوا ہے اور آج پاکستان اپنے قبضے کو بر قرار رکھنے کے لئے بلوچوں پر غیر انسانی سلوک پر اتر آیا ہے بلوچوں کے ساتھ پاکستان کی غیر قانونی ناجائز جنگ اور خونی کھیل نے جنگی جرائم کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے گئے ہیں

جنگ پر بھی لاگوں ہونگے۔

6۔اگر کوئی ریاست درجہ بالا قواعد سے انحراف کرے گی تو جرمانہ ادا کرنے کی حق دار پائے گی۔جب ہم پاکستان کی جنگی حرکات وسکنات کو بین الاقوامی کانفرنسوں کے قواعد وضوابط اور اصولوں کے تناظر میں پرکھتے ہیں تو پاکستان درجہ بالا ایک اصول پر عمل نہیں کررہا ہے بلکہ ان تمام اصولوں کی کھلے عام خلاف ورزیوں کا مرتکب ہورہا ہے، عام شہریوں کو ہلاک کر کے ان کے گھروں کو نذر آتش مال مویشی فصلوں کو تباہ اور قیمتی اشیا کولوٹا جارہا ہے زمینی افواج کی کاروائی پر بمباری کررہا ہے جو کہ اصولاً ان کے ممانعت کی گئی ہے۔قانونی بمباری وہی کہلائے گی جو اسلحہ ساز فیکٹریاں اور فوجی مواصلات کے نظام کی تباہی اور فوجی مقاصد کے پیش نظر اگر فوجی مقامات کی تباہی کے ساتھ وسیع پیمانے پر شہری تباہی بھی یقینی ہو تو ایسی بمباری کی بھی ممانعت ہوگی۔یہاں اسلحہ ساز فیکٹریاں اور فوجی مواصلات کے نظام دور کنار پاکستان تو وسیع پیمانے پر شہری آبادی پر گن شپ ہیلی کاپٹروں کے زریعے فضائی بمباری کررہا ہے جس کی مثال بلوچستان کے مختلف شہروں مکران، آواران، جھالاوان، سراوان، کوہلو ڈیرہ بگٹی اور بلوچستان کے دیگر شہروں کے گاوں ہیں جو روزانہ پاکستانی فوج عام بلوچوں کے گھروں پر بمباری کر رہا ہے اور معصوم شہریوں کے جان سے خونی کھیل رہا ہے پھر جھوٹ کا سہارہ لے کر معصوم اور بزرگوں کی شہادت کو مزاحمتکاروں کا نام دیا جاتا ہے جس کی مثال تمپ، شاپک، ہیرونک، پروم، مشکے، بسیمہ، پارود، نیمرغ اور ان میں شامل بلوچستان کے دیگر علاقے ہیں۔ان تمام جنگی قوانین کو پاکستان نے پاوں تلے روند کر جنگی جرائم میں شامل ہوا ہے، یہ تمام جنگی قوانین پاکستان پر بھی لاگو ہوتے ہیں لیکن پاکستان ان کا اطلاق نہیں کررہا۔درجہ بالا قواعد سے انحراف پاکستان سزا کے حق دار ٹھہرنے کے ساتھ جنگی جرائم میں شمار ہوجاتا ہے۔کیونکہ بلوچستان پر پاکستان کی جنگ غیر قانونی، ناجائز اور نا انصافی پرمبنی ہے۔

جنگ کی قانون اور غیر قانونی حیثیت کے متعلق گروشش Grotious اپنی کتاب،، امن اور جنگ،، میں یوں لکھتا ہے کہ انصاف پر جنگ قانونی ہے اور نا انصافی پرمبنی جنگ غیر قانونی ہے، آج ہماری جنگ بھی قانون اور انصاف پرمبنی ہے جبکہ پاکستانی جنگ غیر قانونی اور نا انصافی پرمبنی ہے، کیونکہ پاکستان نے بلوچستان پر قبضہ کیا ہوا ہے اور آج پاکستان اپنے قبضے کو برقرار رکھنے کے لئے بلوچوں پر غیر انسانی سلوک پر اتر آیا ہے بلوچوں کے ساتھ پاکستان کی غیر قانونی ناجائز جنگ اور خونی کھیل نے جنگی جرائم کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے گئے ہیں، اگر بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیموں مثلاً یونیورسل ڈیکلیریشن آف ہیومین رائٹس، ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومین رائٹس واچ، ہیومین رائٹس آرگنائیزیشن اور یوروپی یونین کے ایک ایک اصول کے تحت پاکستان کی بربریت اور وحشی پن کا چیدہ چیدہ وضاحت کروں تو آرٹیکل بہت بڑا ہوگا، اگر ہو سکا ان کے متعلق ایک اور مضمون لکھنے کی کوشش کرینگے، یہاں صرف میں نے بین القوامی عہدناموں کے تناظر میں پاکستان کی جنگی جرائم کا مختصر وضاحت کی جن کے تناظر میں پاکستان براہ راست جنگی جرائم میں شامل ہورہا ہے، اور متعلقہ ذمہ داروں کی قانونی اور انسانی فرض بنتی ہے کہ وہ پاکستان کو اس جنگی جرائم کے گھناونے کھیل میں کیفر کردار تک پہنچا کر اپنی آواز کو محکوم بلوچوں کی آواز کے ساتھ ملا کر انسانیت کے امن کے ایک نئے باب کا انسانیت کی تاریخ میں اضافہ کر کے انسانیت کے حقوق کے حق ادائیگی کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆